تعمیر حیات

لکھنؤ
پندرہ روزہ

۲۹۹۲م
۸۹۵۹۴

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

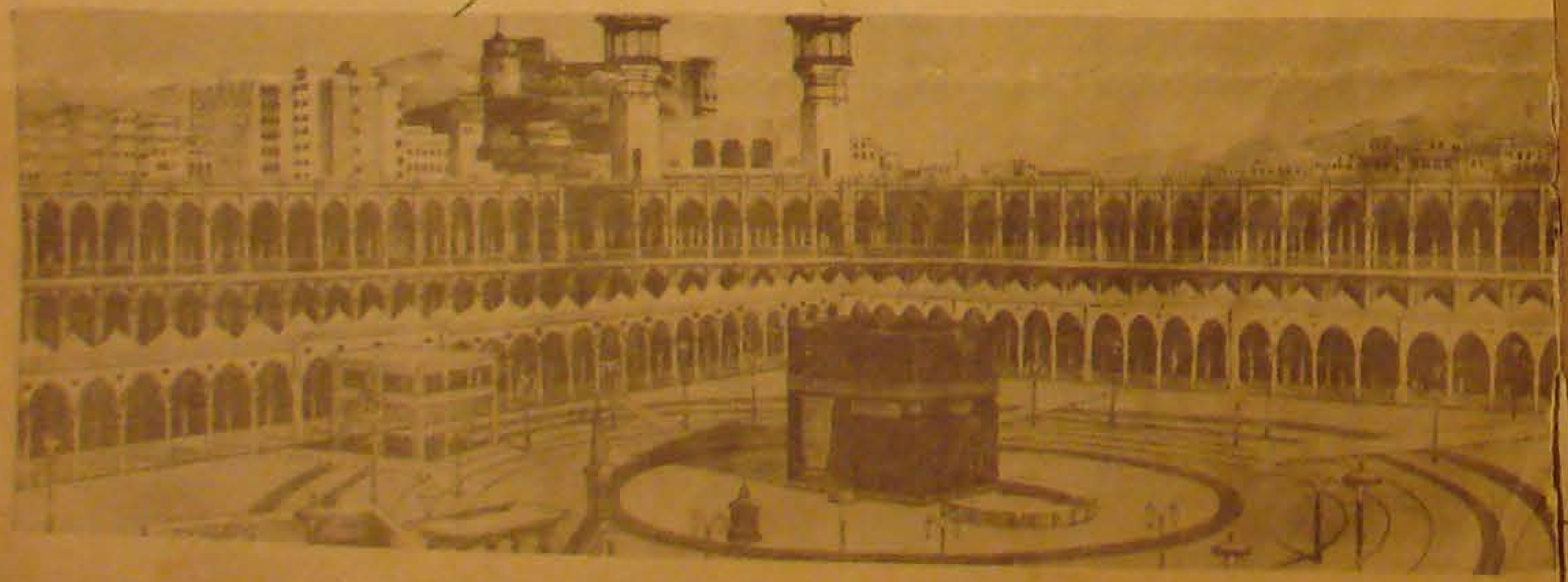

آجائے، تو آپ پکا نہیں سکتے۔ لیکن گر گئے کی دم کسی درخت وغیرہ سے پھنس جائے تو کتے کو غصہ نہیں آتا۔ اس کو ذی شعور پر غصہ آتا ہے اس کے اندر بھی خدا نے یہ شعور پیدا کیا کہ ذی شعور ذمہ دار ہے۔ ہمارے یہاں گدھے سے زیادہ کوئی بیوقوف جانور نہیں سمجھا جاتا۔ گدھا بھی یہ بات سمجھتا ہے، لیکن ہم اور آپ کیوں نہیں سمجھتے؟ مجھے بتائیے کہ انسان، انسان پر کیسے گرتا ہے؟ پہاڑ انسان پر گرے معاف کر دیا جائے، دریا انسان پر گرے معاف کر دیا جائے پتھر انسان پر گرے معاف کیا جا سکتا ہے، چھت گر جاتی ہے معاف کی جا سکتی ہے، آگ لگ جاتی ہے معاف کی جا سکتی ہے، مگر انسان کو معاف نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ خدا نے اس کو عقل دی ہے۔ خدا نے اس کو شعور دیا ہے، خدا نے اس کو دل دیا ہے، خدا نے اس کو ضمیر دیا ہے، اور اس کو انسانوں کی طرح پالا گیا، لیکن انسان، انسان کو انسان نہیں سمجھتا مجھے حیرت ہے۔ ایک شخص اپنے آفس میں بیٹھا ہوا ہے، اچھا خاصا پڑھا لکھا ہے کوالیفائڈ Qualified آدمی ہے اور اس کام کے لئے بیٹھا ہے کہ جب کوئی اس سے خدمت لینے آئے، فائل نکلوانے آئے، جب کوئی کام کروانے آئے یا کوئی آرڈر لے کر آئے فوراً اس کی تعمیل کرے، وہ بیچارا وہاں سے چلا، آدمی اپنے ساتھی سے کہتا ہے "موٹا شکار ہے۔ موٹی اسامی ہے"۔ گویا اس کے نزدیک ایک چوہا آیا، ایک موٹا سا چوہا، بلی جیسے چوہے کو آتا ہوا دیکھے، اس طرح یہ انسان انسان کو دیکھتا ہے، بڑا موٹا شکار ہے، بڑی موٹی اسامی ہے، خوب پیسہ اس سے وصول ہوگا، ارے خدا کے بندے، بے رحم انسان تجھے تو دو قدم، چار قدم اٹھ کر جانا چاہیئے تھا — اس کا Reception کرنا چاہیئے تھا، اس کو گلے لگانا چاہیئے تھا کہ میں اسی سیوا کے لیے یہاں بیٹھا ہوں خدا نے تم کو بھیجا ہے، تو تم خدا کی نعمت ہو میرے لیے، اگر تم یہاں نہ آؤ تو میں بیکار ہوں، میں نے کس لیے بھاڑ جھونکا، میں نے کس لیے آنکھیں پھوڑیں، میں نے اسی لیے پڑھا تھا، اس لیے آنکھیں خراب کی تھیں کہ میں تم جیسے آدمیوں کی خدمت کروں، گھر بیٹھے مکھی مار رہا تھا، گھر بیٹھے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا، میرا کوئی کام نہیں تھا، تم کو خدا نے بھیجا،

پھر یہ آنے والا کون ہے؟ اپنی ماں کا لال، جب یہ بیمار ہوا تھا تو اس کی ماں نے رو رو کر رات کاٹی تھی، اور ڈاکٹر کے گھر میں جا جا کر دہائی دی تھی خدا کے لیے میرے جگر کے بیٹے کو بچا لیجیے۔ اس نے روتے ہوئے کہا، اے خدا میری جان لے لیجئے اور میرے بیٹے کو بچا لیجئے۔ اس کی جان بچ جائے یہ ایسا لاڈلہ تھا، اپنے ماں باپ کی آنکھ کا تارا تھا، اب وہ آیا ہے تمہارے پاس تو گویا ایک چوہا آیا، گویا ایک بلی آئی ہے، ایک موٹا شکار آیا کہ تم اس کا خون چوس لینا چاہتے ہو، اس سے بڑھ کر انسانیت کا زوال کیا ہے، بھیڑیا بھیڑئیے کے یہاں چلا جائے، بھیڑیا اس کو مارتا نہیں ہے، کتا کتے کے پاس چلا جائے تو کتا اس پر حملہ نہیں کرتا، جب تک کہ وہ پاگل نہ ہو، ایک انسان ایک انسان پر کیسے حملہ کر سکتا ہے، یہ وہ پہیلی ہے جو آج تک کوئی بجھا نہیں سکا میں آپ سے اس پہیلی کو بوجھنا چاہتا ہوں کہ یہ دورے کیسے پڑتے ہیں؟ اگر کسی ایک کے دماغ بگڑ جائے تو بڑ جائے اس کا سب پڑھا لکھا غارت، جو ماں باپ نے سکھایا سب بھول گیا، جو استادوں نے اسکولوں کالجوں میں سکھایا وہ بھول گیا، جو کتابوں میں پڑھا تھا بڑے شوق سے لائبریری میں جا کر مطالعہ کیا تھا وہ سب بھول گیا، ایک منٹ میں یہ سب صفایا کیسے ہو جاتا ہے۔

تعلیم سب کچھ کرتی ہے مگر آدمی کو آدمی نہیں بناتی:

اس کی وجہ کیا ہے کہ وہ پڑھا لکھا بن گیا Educated بن گیا، کلچرڈ ہو گیا، Well read بھی اور بڑا لبرل بھی اور بڑا تھنکر بھی سب کچھ، لیکن آدمی نہ بن سکا، اگر تعلیم سب کچھ کرتی ہے، لیکن آدمی کو آدمی نہیں بناتی تو پھر یہ دو کوڑی کی۔ امریکہ کی تعلیم، یورپ کی تعلیم اگر انسان کو مہذب نہیں بنا سکتی، اگر انسانیت کا احترام نہیں پیدا کر سکتی، اگر اس کے ضمیر کو نہیں جگا سکتی، اگر خدا کا خوف اس کے دل میں نہیں بٹھا سکتی۔ اگر انسان کی خدمت کا جذبہ اس کے اندر نہیں پیدا کرتی۔ اس تعلیم سے جہالت اچھی، جب انسان جاہل تھا، انسان کی حفاظت کرتا تھا، انسان کی عزت اور آبرو کے لئے جان دے دیا کرتا تھا، انسان، انسان کے لیے پہرہ دیا کرتا تھا وہ سوتا تھا اور یہ جاگتا تھا تاکہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہونچے، وہ دور اچھا تھا اس دور سے جس میں اتنی تعلیم ہے، گھر گھر تعلیم ہے، گاؤں گاؤں تعلیم ہے، مگر اس کا نتیجہ کیا ہے؟ کوئی دیوانہ، کوئی شریر کوئی فسادی ایک نعرہ لگا دیتا ہے، خواہ وہ قوم پرستی کا نعرہ ہو، خواہ کمیونزم کا نعرہ ہو۔ وہ Riot کرا دیتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک کو کیسے مہذب کہا جائے، جہاں دن رات رائٹ Riot ہوں، تہذیب اور رائٹ دونوں جمع نہیں ہو سکتے، انسان، انسان کا شکاری ہو، انسان، انسان کے خون سے اپنی پیاس بجھائے، لعنت ہے ایسے انسان پر، وہ انسان نہیں اس سے جانور بہتر ہیں، درندے بہتر ہیں۔

انسان اندر سے بنتا ہے، باہر سے نہیں بنتا:

بات یہ ہے کہ انسان اندر سے بنتا ہے باہر سے نہیں بنتا، ہم نے اندر کو بھلا دیا ہم نے اندر کے انسان کو نہیں جگایا ہمارے اس انسان کے اندر ایک اور انسان چھپا ہوا ہے وہ اندر کا انسان ہے، وہ دل والا انسان ہے، وہ ضمیر والا انسان ہے، وہ خدا سے ڈرنے والا انسان ہے جب وہ انسان جاگ جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ بڑی بڑی سلطنتیں، شہنشاہیاں Empire ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، لیکن ان کا حال کیا ہوتا ہے؟ وہ قوم کے پیسے کو، ملک کے پیسے کو خدا کی امانت سمجھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ پوری قوم مالک ہے اور میں اکیلا خادم ہوں، غلام ہوں۔

انسانیت کے بیش بہا نمونے:

دو واقعے آپ کو سناتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں پروفیسر صاحب سے کہ میں ہسٹری کا طالب علم ہوں اور میری پہونچ وہیں تک ہے، خلیفہ اول کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جب خلیفہ ہوئے یعنی جب مسلمانوں نے ان کو اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جگہ پر منتظم و رہنما مان لیا، اس وقت مسلمانوں کی ایک طرف Roman Empire کی طرف فوجیں بڑھ رہی تھیں تاکہ وہاں بھی ظلم کو دور کریں، اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکالیں دوسری طرف Persian Empire کی طرف بڑھ رہی تھیں اس وقت کتنا بڑا خزانہ ہوگا مسلمانوں کا، حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کی بیوی نے کہا آپ جب سے خلیفہ ہوئے ہیں مسلمانوں کو جو کچھ فائدہ ہوا ہو ہم اس سے انکار نہیں کرتے لیکن ہمارا بڑا نقصان ہو گیا۔! انہوں نے فرمایا کیا نقصان؟ بیوی نے کہا کہ آپ نے جو پیسے مقرر کرائے ہیں اور جو آپ کو مسلمانوں کے بیت المال (ٹریزری) سے ملتے ہیں اس میں بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ ہمارا اور بچوں کا پیٹ بھر جائے کتنے دن ہو گئے، آپ کو خلیفہ بنے ہوئے، ہم ابھی تک کوئی میٹھی چیز نہیں کھا سکے، ہمارے منہ کا مزہ خراب ہے ہم کیا کریں اس سے تو ہم اسی وقت مزے میں تھے جب آپ کپڑوں کی تجارت کرتے تھے جب ہی ہم بھلے تھے، اب اس کے بعد آپ خلیفہ ہوئے نام تو بہت اونچا لیکن ہمارا کوئی فائدہ نہیں۔

انہوں نے کہا بی بی! میں کیا کروں مسلمانوں کا مال تو اس لیے نہیں ہے کہ ابوبکر کے گھر والے اپنا منہ میٹھا کریں، مسلمانوں کے فنڈ میں اتنی گنجائش نہیں۔ بیوی نے کہا کہ اسی میں سے ہم کچھ بچا لیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟ کہا اس پر کیا اعتراض؟ یہ تمہاری سلیقہ مندی کی بات ہے! دس دن، پندرہ دن، بیس دن، اس بیچاری نے پیسے کاٹے اس میں سے دو دو پیسے ایک ایک آنہ کم کیا اور اس کے بعد بارہ آنے، ایک روپیہ کچھ لا کر ان کو دیا اور کہا کہ لیجئے، جو آپ دیتے تھے اسی سے کاٹ کاٹ کر یہ رقم میں نے جمع کی... اسی سے اتنا گھی، اتنی شکر، اتنی سوجی منگوا دیجئے، آپ جانتے ہیں کہ انہوں نے کیا کیا؟ تو مسلمانوں کے ٹریزری آفیسر یا بیت المال کے منتظم کو جا کر دے دی اور کہا کہ یہ بارہ آنے پیسے بچے ہیں ان کو مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کر لیجئے اور تجربہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اتنے پیسے کم دیے جائیں جب بھی گذارا ہو جائے گا۔ یعنی آپ دس آنے دیا کرتے تھے تو اب آٹھ آنے دیا کیجئے اس لیے کہ ہماری بیوی نے یہ ثابت کر دیا کہ اتنے پیسے کم دیے جائیں جب بھی گذارہ ہو جائے گا کوئی مرے گا نہیں، گھر میں فاقہ نہیں ہوگا،

بیوی نے کہا واہ واہ ہم نمازیں معاف کرانے گئے تھے روزے گلے پڑ گئے، یعنی اس سے تو ہم پہلے ہی اچھے تھے کہ بارہ آنے روزانہ میں گذر ہوتا تھا اب دو آنہ پیسہ کم کر کے ہم کو ملا کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ "مسلمانوں کا فنڈ اس لیے نہیں کہ الٹے تلے ہوں مٹھائیاں بنیں اور حلوا پکے"۔

ایک واقعہ اور سناتا ہوں۔ یہ واقعات وہ ہیں جو ہماری آپ کی ملکیت ہیں، یہ کسی خاص کمیونٹی کی ملکیت نہیں، ان پر ہم کو آپ کو سب کو فخر کرنے کا حق ہے اس لیے کہ یہ انسانوں کے واقعات ہیں، ہم بھی انسان ہیں اور وہ بھی انسان تھے، ہمارا سر اونچا ہونا چاہیے کہ ہماری نسل میں، ہماری Race میں Man kind میں ایسے لوگ ہوتے ہیں، جب پہلی کانگریس گورنمنٹ قائم ہوئی تھی تو گاندھی نے کہا تھا "ہمارے منسٹروں کو وہ زندگی اختیار کرنی چاہیئے جو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے گذاری تھی"۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں اسلامک ایمپائر اتنا بڑھ گیا تھا کہ شام Syria مصر Egypt اور عراق، اسپین تک پہونچ گیا تھا، اور شمالی افریقہ سارا فتح ہو گیا تھا، اس وقت کا ایک واقعہ سناتا ہوں، ایک دن رات کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کام کر رہے تھے اور آپ کی حکومت State اسٹیٹ کی شمع جل رہی تھی، بجلی اس زمانہ میں نہیں تھی مشعل اور شمع جلتی تھی، اس کو سامنے رکھے ہوئے کاغذات، فائل دیکھ رہے تھے، دستخط کر رہے تھے کہ اتنے میں ان کے ایک دوست آئے انہوں نے کہا لو خوب آئے آؤ بھی کہاں سے آئے، وہ جہاں سے آئے تھے اس ملک کا نام لیا گیا کہو بھئی وہاں سب لوگ خوش ہیں؟ سب کو کھانے کو ملتا ہے؟ انہوں نے کہا امیر المومنین سب نے سلام کہا ہے اور سب خوش ہیں، سب بڑے مطمئن ہیں، کوئی کسی پر زیادتی نہیں کرتا، اس کے بعد آنے والے نے پوچھا "امیر المومنین کہئے آپ کے گھر میں بھی خیریت ہے؟ آپ کے فلاں بچے کہاں ہیں؟ آپ کی فلاں لڑکی کہاں ہے؟ بچے کیا پڑھ رہے ہیں؟ یہ پوچھنا تھا کہ انہوں نے پھونک مار کر شمع بجھا دی، انہوں نے کہا خیریت؟ کیا بات کیا بات؟ انہوں نے کہا ابھی تک تو ہم پبلک انٹرسٹ کی بات کر رہے تھے، اب تم نے ہماری گھریلو Domestic، ہماری پرائیویٹ باتیں پوچھنی شروع کیں، اس کام کے لیے یہ شمع نہیں ہے۔ میں اس کا پیسہ اس میں نہیں خرچ کرنا چاہتا، نوکر سے کہا ہمارے گھر کا چراغ لاؤ، وہ لایا کہا اب بات کرو، وہ تو میں نے سرکاری کام کے لئے جلائی تھی، فائلیں دیکھ رہا تھا، اور تم آئے، میں نے تمہارے ملک کی جہاں سے تم آئے ہو خیریت دریافت کی جو سرکاری کام ہے، اب تم قصہ لے بیٹھے میرے گھر کا، ان قصوں کے لیے میں مسلمانوں کا پیسہ ان کے نیشنل فنڈ میں سے خرچ کرنا صحیح نہیں سمجھتا، آج دنیا میں ہے کوئی مثال اس کی؟ امریکہ کے پریسیڈنٹ بھی ہیں اور روس کے پریسیڈنٹ بھی ہیں اور بڑے بڑے ملکوں کے عرب ملکوں کے پریسیڈنٹ اور بادشاہ بھی ہیں، میں صاف کہتا ہوں کوئی اس معیار پر پورا نہیں اترتا، نہ سعودی عرب کا، نہ مصر کا، نہ عراق کا، یہ سب مسلم مجارٹی کے ملک ہیں، لیکن کسی کو اس احتیاط کی ہوا بھی نہیں لگی، اس لیے کہ جو تربیت خدا کے پیغمبر، رسول خدا نے اپنے صحابیوں کو دی تھی وہ ان کو ہرگز میسر نہیں آئی، میں جانتا ہوں، میں ان سے ملتا بھی ہوں میں ان کا احترام بھی کرتا ہوں اور میں وہاں آرام سے رہتا ہوں لیکن میں صاف بات کروں گا۔

ہم نے جو کچھ کھویا ہے اندر کھویا ہے:

اب آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں، آپ اس ملک کی خبر لیجئے، انسان کو انسان بنائیے اپنے لال لخت جگر کے ٹکڑوں کو انسان بنائیے، ہم نے جو کچھ کھویا ہے، اندر کھویا ہے اور ہم تلاش کر رہے ہیں باہر، اس پر مجھے ایک کہانی یاد آ گئی جو میں نے بچپن میں سنی تھی کہ کوئی صاحب گھر کے باہر کچھ ڈھونڈ رہے تھے کوئی بڑے میاں تھے، قاعدہ ہے کہ ایسے موقع پر چلتے ہوئے راہگیر رک جاتے ہیں کہ آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں، کیا گرا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک روپیہ گر گیا ہے میں ڈھونڈ رہا ہوں، یہ راہ گیر بھی ڈھونڈنے میں لگ گئے مگر وہ روپیہ مل نہیں رہا ہے، روشنی ہے اور مل نہیں رہا ہے، انہوں نے کہا کہ یہ تو بتائیے کہاں گرا تھا؟ ہم خاص طور پر اسی جگہ تلاش کریں، انہوں نے کہا بھائی سچی بات تو یہ ہے کہ وہ گھر میں گرا تھا، گھر میں اندھیرا ہے، یہاں روشنی ہے اس لیے یہاں ڈھونڈنے آیا ہوں، لائٹ نہیں کہ اندر ڈھونڈھوں۔ آج ہمارا آپ کا سب کا حال یہ ہے کہ چیز کھوئی کہیں اور ہے، ڈھونڈھ رہے ہیں کہیں۔

چیز جہاں کھوتی ہے وہیں ملتی ہے:

چیز کھوتی ہے دل میں اور ڈھونڈھ رہے ہیں کالجوں میں، لائبریریوں میں، امریکہ یورپ میں، پولیٹکل پارٹیز میں، پارلیامنٹ میں، اسمبلیز میں، اور خدا کا قانون یہ ہے خدا کا قانون بدلا نہیں کرتا کہ جو چیز جہاں کھوئی تھی وہیں ملے گی، یہ خدا کا قانون ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ جو چیز جہاں کھوئی وہیں اس کو تلاش کرو۔ اگر اندھیرے ہی میں گری ہے تو روشنی وہاں لے جاؤ، یہ ہو سکتا ہے لیکن اگر اندھیرے میں گری ہے اس لئے وہاں نہیں تلاش کرتے ہو، روشنی میں تلاش کرنے آئے ہو کبھی نہیں ملے گی۔ (پرجوش تالیاں) تو بھائی وہ سیدھے سادے کوئی بزرگ تھے، بڑے میاں تھے، لیکن آج تو بڑے اسکالر، فلاسفر بھی کر رہے ہیں، چیز کھوئی ہے ہمارے دل میں، ہمارے ہردے میں، ہمارے ہارٹ میں، ہمارے Conscience میں اور ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں سیاست میں، ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں لیڈرشپ میں، اور مطالعے کی جگہوں پر۔

بس بھائی وہ چیز کھوئی ہے ختم نہیں ہوئی ہے، کھوئی ہوئی چیز مل جاتی ہے، مری ہوئی چیز زندہ نہیں ہوتی، میں انسانیت کو سویا ہوا سمجھتا ہوں، مرا ہوا نہیں سمجھتا۔ انسانیت سو بار سوئی، سو بار جگائی گئی، خدا کے پیغمبر آئے، بڑے بڑے علم رکھنے والے، بڑے بڑے ودوان، خدا سے ڈرنے والے آئے، انہوں نے انسانیت کو جگایا جاگ گئی اگر مر گئی ہوتی تو کبھی زندہ نہ ہوتی۔

انسانیت مری نہیں سوئی ہوئی ہے:

آج بھی انسانیت مری نہیں ہے، سوئی ہوئی ہے، آئیے ہم آپ سب مل کر سوئی ہوئی انسانیت کو جگائیں، پہلے اپنے اندر جگائیں، اس کے بعد باہر جگائیں، ہم اگر جاگے ہوئے نہیں ہیں تو دوسروں کو بھی جگا نہیں سکتے، سویا ہوا سوئے ہوئے کو نہیں جگا سکتا، ایک جاگتا ہوا سیکڑوں سوئے ہوؤں کو جگا دیتا ہے لیکن سو سوئے ہوئے ایک سوئے ہوئے کو بھی جگا نہیں سکتے، اگر ہم سب سو گئے ہیں تو ہم سوتے رہیں گے ہم ایک دوسرے کو جگا نہیں سکتے، ہم میں ایک آدمی بھی جاگ اٹھے تو ہزاروں، لاکھوں سوئے ہوؤں کو جگا دے گا۔

اسی امید پر ہم لوگ پھر رہے ہیں۔ ہم اس ملک کو برباد ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے، ہمیں یہاں رہنا بھی ہے، سفر بھی کرنا ہے، پڑھنا لکھنا بھی ہے، اس ملک میں آپ جیسے مصنف اور مورخ بھی ہیں، اسکالر بھی ہیں، یہ جو کچھ رونق ہے یہ سب امن و امان کی ہے نارمل حالات کی ہے، نارمل حالات نہ ہوں، بارش کا زمانہ ہوتا، بجلی چمک رہی ہوتی اور ذرا سا پانی برسنے لگتا، یا ایک کڑاکا ہوتا تو سارا مجمع منتشر ہو جاتا، اگر یہاں اس مجمع میں سانپ آجائے یا کوئی بچھو نظر ہی آجائے تو ابھی آپ سب تتر بتر ہونے لگیں گے، یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں یہ سب Normalcy کا نتیجہ ہے، نارمل حالات اگر ملک میں ہوں گے تو آپ اس ملک کو جتنا اونچا کیجئے جتنا بڑھائیے علم و فن کی جتنی تحقیقات کیجئے آپ اس کو ٹکنالوجی میں، اور سائنس میں امریکہ بنا دیجئے اس سے بھی آگے بڑھا دیجئے لیکن سب نارمل حالات میں ہوا ہے، وہاں بھی نارمل حالات میں ہوا ہے، یہاں بھی نارمل حالات میں ہوگا، بس ہم اسی کے لئے پھر رہے ہیں، اور اپنا درد دوسروں کے سامنے رکھ رہے ہیں، ابھی ہم اپنے کو اکیلا محسوس کرتے ہیں، ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں پارٹیز میں، ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں لائبریریز میں، لیکن ہم اکیلے نہیں رہیں گے۔

مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں:

جب اتنا بڑا مجمع سیوان جیسے شہر میں ایک ذرا سی آواز پر جمع ہو سکتا ہے تو اس ملک سے مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، یہ ملک جاگتا ہے اور دوسرے ملکوں کو انشاء اللہ جگائے گا، مگر ضرورت تھوڑی سی محنت کرنے کی ہے، ہمارے لیڈروں نے Country Building کا کام تو کیا لیکن Nation Building کا کام نہیں کیا گاندھی جی کرنا چاہتے تھے ان کو پورا موقع نہیں ملا، اور ان کے بعد جن لوگوں نے اس کام کا ارادہ کیا وہ سیاسیات میں پھنس کر رہ گئے ہیں، ان کی نیت پر حملہ نہیں کرتا لیکن یہ کام رہ گیا اب یہ کام ہمارے آپ کے جیسے آدمیوں کا ہے، سارے ملک میں آواز لگائیے سارے ملک میں ایک مہم چلائیے کہ اے آدمیو! اے انسانو! انسان بنو، ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھو، اور دیکھو لہریں اٹھیں گی، اور دیکھو لوگ تمہیں پاگل بنانا چاہیں گے، لوگ تم سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیں گے، لوگ تمہیں Exploit کریں گے لیکن تم ایکسپلائٹ نہ ہونا، یہ آپ کو بتانے کی ضرورت ہے کہ اب فسادات کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہونا چاہیے۔ بداخلاقی ہمیشہ کے لئے بند ہونا چاہیے، انسان، انسان کو خدا کی نعمت سمجھے، اپنا بھائی سمجھے، سیکھے کہ اس کے بغیر تو زندگی کا لطف ہی نہیں اگر یہ فن ہم سیکھ لیں گے تو گویا ہم نے سب کچھ سیکھ لیا۔

وفات حسرت آیات

بڑے افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ شام کے ایک ممتاز عالم اور بزرگ

علامہ شیخ
حسن حبنکہ میدانی

کا مورخہ ۱۳؍ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ بروز دوشنبہ انتقال ہو گیا
انا للہ وانا الیہ راجعون
ان کی زندگی پر ایک مضمون اگلے شمارہ میں انشاء اللہ شائع ہوگا۔

سید سلمان حسینی ندوی

فقہ اسلامی کی تشکیل جدید
اس کی حقیقت اور ضرورت

یہ مقالہ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس منعقدہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں بتاریخ ۷ر اکتوبر ۸۴ء کو پڑھا گیا۔

شریعت اسلامیہ پر تاریخ اسلامی کی نابغۂ روزگار شخصیتوں کے غور و فکر اور استنباط و تخریج کے نتیجہ میں وہ فقہ اسلامی وجود میں آیا جس نے صدیوں تک اسلامی دنیا پر حکمرانی کی آج بھی اور ہر آنے والے دور میں وہ حکمرانی کی صلاحیتوں سے بھرپور ہے اور رہے گا۔

حدیث نبوی میں ہر صدی کی ابتداء میں دین کے تجدیدی کام کی جو پیشین گوئی کی گئی ہے، تاریخ اسلامی اس کی تصدیق کے لئے اپنی گود میں سینکڑوں مثالیں رکھتی ہے، دین حنیف کی تجدید کا گوناگوں کام دین کے مختلف شعبوں میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے، جس طرح حضرت حسن بصری اسلامی روحانیت کے مجدد، حضرت عمر بن عبد العزیز خلافت اسلامیہ کے مجدد، امام بخاری علوم حدیث نبوی کے مجدد ہیں۔ اسی طرح ائمہ اربعہ شریعت اسلامیہ کے وہ عظیم مجدد ہیں جنھوں نے شریعت اسلامیہ کی حفاظت بھی کی۔ تبویب بھی کی تجدید بھی۔

یہ تجدیدی کام ہر دور میں ہونا ناگزیر تھا اور ہوتا رہا۔ طحاوی ہوں یا خطابی، ابن دقیق العید یا عز الدین ابن عبد السلام، ابن تیمیہ حرانی ہوں یا ابن قیم جوزی، سیوطی ہوں یا ابن ہمام یا حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی، یہ اور ان جیسے فقہائے محدثین اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

یہ تجدیدی کام جن بنیادی عناصر پر مبنی تھا۔ ان میں اپنے دور کے حالات، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل اور مشکلات سے واقفیت گذشتہ فقہاء و مجتہدین کے نتائج فکر و نظر کا احادیث صحیحہ کی روشنی میں جائزہ، تنقیح و تنقید اور ترتیب جدید خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ جامع کبیر و جامع صغیر وغیرہ اور پھر "مبسوط" اور پھر بعد کی کتب کا ترتیب وار جائزہ لیتے ہوئے ہدایہ" تک آئیے تو کم سے کم یہ بات ضرور ملے گی کہ عصری تقاضوں کے مطابق تدوین و ترتیب جدید کا کام انجام دیا جا رہا ہے، اسی طرح کتاب الام سے شرح المہذب تک ان عظیم علماء کی علمی کاوشوں کا جائزہ لینے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ تجدیدی کام کے وسیع میدان کا کوئی نہ کوئی گوشہ پر کیا جا رہا ہے۔

عام طور پر یہ لکھا اور کہا جاتا ہے کہ پانچویں صدی کی ابتداء سے اجتہاد کے دروازے بند ہو گئے اور آئندہ صدیوں کے لئے کسی ایک امام کی تقلید سے چارہ کار نہ رہا۔ یہ بات جہاں شرعی نصوص کے خلاف ہے وہاں تاریخ کے بھی خلاف ہے، فقہی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کا کام مسلسل رہا اور کوئی دور بھی مجتہدین سے خالی نہیں رہا۔ خواہ وہ کسی قسم کے اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض وہ حقیقتیں جو تاریخ فقہ کی طبعی رفتار کا اقتضا تھیں۔ ان کو ہم نے شرعی یا قانونی حکم تصور کر لیا۔ ائمہ اربعہ اور ان کے دور میں کئی مستقل اور مطلق مجتہدین، جن میں بلا تکلف امام اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان ثوری اور کچھ متاخر، ابو داؤد ظاہری، ابن جریر طبری وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے — کا وجود اس کی دلیل نہیں کہ اجتہاد مطلق مستقل ان کی ذات پر منحصر تھا اور وہی اس صلاحیت کے مالک تھے۔ بعد کے لوگ اس درجہ کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کا زمانہ سابق میں ہونا، اور عہد نبوی سے قرب کی وجہ سے اجتہاد کے بعض شعبوں۔ خصوصیت سے رواۃ کے بارے میں قریب سے واقفیت رکھنے۔ بعد میں آنے والے لوگوں پر فائق ہونے کی بنیاد پر ان کو اجتہاد مطلق اور مستقل کا درجہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہاب الدین مرجانی حنفی، ائمہ ثلاثہ، امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر کو مجتہد مطلق قرار دیتے ہیں۔ یہی حال امام مزنی، زعفرانی وغیرہ کا امام شافعی کے ساتھ ہے۔ ان عظیم فقہاء و محدثین کا تعلق کیونکہ امام ابوحنیفہ یا امام شافعی سے تلمذ کا تھا اس لئے ان کو مجتہد مطلق منتسب کہا جاتا ہے، لیکن شاگرد کا استاذ سے بڑھ جانا نہ شریعت کے مخالف ہے نہ تاریخ کے نہ واقعہ کے۔

تنقیح و تنقید اور تجدید کے کام کی مقدار، وسعت اور گہرائی میں جو فرق عام طور پر امتداد زمانہ سے آتا رہا وہ انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں میں نقص و کمزوری سے کچھ مختلف نہیں لیکن جس طرح دعوتی اور روحانی شعبوں کے لئے مجددین آتے رہے اور شیخ عبد القادر جیلانی سے حضرت مجدد سرہندی تک اسلام کی تازگی، حرارت و قوت، اور روحانی صلاحیتوں کی تجدید کا کام زور و شور سے کیا جاتا رہا۔ اور صحابہ کرام کے عہد کی یادیں تازہ ہو گئیں اور اسی طرح اسلامی تاریخ کا دامن کبھی بھی شریعت اسلامیہ میں تجدیدی کام انجام دینے والوں سے خالی نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کام ظاہری طور پر کس درجہ کامیاب رہا، اور کتنے افراد نے اس کو قبول کیا، لیکن کام کرنے والے نے کام کر کے احقاق حق کر دیا، اور جس شعبے میں کام کا بیڑا اٹھایا، اس پر پڑ جانے والی دبیز تہوں کو چاک کر دیا۔ اور شرعی عصری تقاضوں کے لئے بھرپور سامان مہیا کر دیا۔

میں فقہ اسلامی میں تجدیدی کام کی دو مثالیں اسی ہندوستان سے پیش کرتا ہوں کیونکہ ان کا سمجھنا ہمارے لئے زیادہ آسان ہوگا۔ ایک مثال حضرت اورنگ عالمگیر کی ہے جن کو اسلامی قوانین نافذ کرنے کا جب اسی سرزمین ہند پر موقع ملا تو انہوں نے وقت کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق فقہ حنفی کی تشکیل جدید کا کام "فتاویٰ عالمگیریہ" کی شکل میں انجام دیا۔ اور وہ قانون ان کے طویل عرصۂ حکومت تک چلتا رہا اور اس کے بعد بھی کسی نہ کسی ناقص شکل میں وہ قانون نافذ کیا جاتا رہا۔ اس کے بعد مغل سلطنت کو کوئی ایسا حکمراں نصیب نہ ہوا جو وقت کے رخ اور رفتار کا جائزہ لے کر پھر تشکیل جدید کا کام کرتا۔

اب علوم اسلامیہ کا وہ عظیم مجدد افق ہند پر ابھرا جس نے بڑی حکمت کے ساتھ اس سطحی علمی ماحول میں اپنا تجدیدی مشن شروع کیا اور تجدیدی کام کے اصول و حدود متعین کر کے اور اس کی "مصفیٰ" کی شکل میں ایک بہترین مثال پیش کر کے چلا گیا، اس نے بڑی بلند آہنگی سے اجتہاد کے مقفل اور پہرہ بٹھائے ہوئے دروازہ کو کھولا۔ اس نے کہیں اشاروں میں باتیں کیں، کہیں حکمت کے لطیف پیرایہ میں منزل مقصود تک لانے کی کوشش کی اور اس طرح اپنی عرضداشت رکھی:۔

"ان فی المذهب الحنفی طریقة أنیقة هی اوفق الطرق بالسنة المعروفة التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابه، وذلک أن یوخذ من اقوال الثلاثة قول أقربهم فی المسئلة ثم بعد ذلک یتبع اختیارات الفقهاء الحنفیین الذین کانوا من علماء الحدیث فرب شیٔ سکت عنه الثلاثة فی الاصول وما تعرضوا النفیة ودلت الاحادیث علیه فلیس بد من اتباعه والکل مذهب حنفی۔"

اس دعوت کا اعلان انہوں نے اس وقت کیا جب کہ انہوں نے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی کہ امام ابو یوسف اور امام محمد بھی مجتہد مطلق ہیں۔

یہاں پر یہ بات یاد رہے کہ اس طریقہ پر عمل کرنے سے ائمہ اربعہ کے مابین صرف ۱۵-۲۰ مسائل میں فرق رہ جاتا ہے اور شاہ صاحب کی اصل دعوت اسی جمع بین المذاہب کی تھی۔ ایک سائل نے جب ان سے ان کے فقہی مسلک کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا،

"انی اجمع بین المذاهب الفقهیة المشهورة ما امکننی، فمثلاً أؤدی الصلاة والصوم والوضوء والغسل والحج علی وضع یحکم علیه اصحاب جمیع المذاهب بالصحة، فاذا تعذر الجمع بینهما فانی اختار أقوی المذاهب من حیث الدلیل وموافقة الحدیث الصریح وقد رزقنی الله سبحانه وتعالیٰ، من العلم بحیث اتمکن من تمیز القوی من الضعیف وأفتی کل مقلد بمذهبه حسب مذهبه الذی یتبعه۔"

یہاں پر یہ بحث مناسب نہ ہوگی کہ شاہ صاحب مجتہد تھے یا حنفی تھے لیکن اتنی بات

کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ شاہ صاحب مجتہد مطلق منتسب تھے لیکن ان کا انتساب صرف امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نہ تھا بلکہ وہ اخذ بالمذاہب الاربعہ کے قائل تھے کیونکہ ان کا عمیق مطالعہ یہ کہتا تھا کہ ان اماماں امت نے مسائل شریعت کا استیعاب کر کے کسی پانچویں مسلک کی ضرورت نہ چھوڑی (ملاحظہ فرمایئے عقد الجید) اس دور میں جس تجدیدی کام کی ضرورت اس مجدد نے محسوس کی اور پھر اس کی حکیمانہ اور متوازن دعوت دی وہ کام ان عناصر سے مرکب تھا۔

۱۔ اجتہاد عنصر حیات ہے اس کا ہر دور میں پایا جانا لازمی ہے اجتہاد کے معدوم ہونے سے نئے مسائل کے لئے بلکہ پرانے مسائل میں پیدا ہونے والے نئے حالات کا حل تلاش کرنے سے فقہ عاجز ہونے لگتا ہے اور اس میں جمود اور تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔

۲۔ فقہی ذخیرہ کو جس میں ہر دور میں مسائل کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، کھنگالتے رہنا چاہئے اور جہاں بھی دلیل کی کمزوری ظاہر ہو جائے وہاں اس مسئلہ کو ترک کرنے میں ذرہ برابر تردد نہ کرنا چاہئے۔

۳۔ علماء کو عامیوں کی سی تقلید سے بلند تر ہونا چاہئے۔ ان کے لئے کم سے کم درجہ مجتہد الفتویٰ کا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ مجتہد مطلق منتسب کا۔ بحیثیت مجتہد الفتویٰ کے کہ جس کا مطالعہ اپنے مسلک کی کتابوں تک محدود ہوتا ہے اور ان میں اس کو درک حاصل ہوتا ہے، اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ احادیث کا تتبع کرتا ہو۔ اگر کسی صحیح روایت سے اس کے مسلک کی مخالفت ہو رہی ہو تو اپنا مسلک ترک کر دے۔ پھر اس سوال کو اٹھاتے ہوئے کہ کیا وہ شخص جو اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا اپنے مسلک کے خلاف حدیث پر عمل کر سکتا ہے یہ جواب دیا ہے کہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح کسی مسئلہ میں دوسرے امام کی تقلید بھی کر سکتا ہے بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ آسانی اور رخصت کی خاطر بھی کسی مسئلہ میں کسی امام کا قول اختیار کر سکتا ہے اور اس کی ممانعت کرنے والوں کو جواب دیتے ہوئے کہا ہے:۔

"ان النبی صلی الله علیه وسلم کان اذا خیر اختار أهون الامرین مالم یکن إثما۔"

اسی طرح اکثر علماء کے قول یا مشہور قول کے اتباع میں اپنا مسلک ترک کر دینا بھی درست قرار دیا ہے۔ انہوں نے مجتہد الفتویٰ کے احکام بڑی تفصیل اور درازنفسی کے ساتھ ذکر کئے ہیں۔ کیونکہ اس وقت عام طور پر نصاب درس اور علماء کے رجحان اور صلاحیتوں کے مطابق اسی اجتہاد کی عملی شکلیں مہیا تھیں۔

۴۔ وہ اصول فقہ کے نام سے ان تمام اصولوں کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے جو فقہی تخریجات پر مبنی ہیں اور ان کی سند ائمہ تک نہیں ملتی، وہ ان اصول فقہ کو اجتہاد کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ (ملاحظہ ہو الانصاف) بلکہ چند مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "ان الخاص مبین لایلحقه البیان، وان الزیادة نسخ وأن العام قطعی کالخاص وأن لاترجیح بکثرة الرواة وأنه لاعبرة بمفهوم الشرط والوصف، وانه لایجب العمل بحدیث غیر الفقیه اذا انسد به باب الرأی"۔ بڑی صفائی کے ساتھ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور صاحبین سے ان اصول کی روایت ثابت نہیں۔ اور ان اصول کا التزام اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا بہ تکلف جواب دینا جیسا کہ بزدوی کی روش ہے متقدمین کا طریقہ نہ تھا۔ اور ان اصول کی مخالفت کرنے والا زیادہ حق بجانب ہے۔

۵۔ ائمہ اربعہ کے مسالک کو جمع کرنے کے سلسلہ میں انہوں نے بطور تمہید اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ فقہ ائمہ اربعہ کا مرکز اتحاد موطأ امام مالک ہے اس چشمے سے یکساں طریقے پر فقہ حنفی کے (اپنے استاد کے ساتھ) مؤسس اور جامع امام محمد اور فقہ شافعی کے مؤسس امام شافعی سیراب ہوئے اور فقہ حنبلی، فقہ شافعی کی ایک شاخ ہے۔

۶۔ اس مجدد علوم اسلامیہ نے اجتہاد جزئی کو بھی جائز قرار دے کر آجکل کے سپشلائزین کے طریقہ کی افادیت کو بھی ثابت کر دیا اور اس طرح آنے والے ہنگامہ خیز زمانہ کے لئے "کشادگی در اجتہاد" کی راہ میں آخری امکانی راہ بھی نکال دی۔

۷۔ حجۃ اللہ البالغہ کے "ساتویں مبحث" "مبحث استنباط الشرائع من حدیث النبی صلی الله علیه وسلم" کو اپنے کلک زریں سے لکھ کر اجتہاد کی راہ کو ہموار اور آسان بنانے کی پوری کوشش صرف کی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں جس کے جمود و تعطل اور مسلکی عصبیت کی جھلک خود شاہ صاحب کی کتابوں میں دیکھی جاتی ہے شاہ صاحب نے ایک ایسا پروگرام پیش کیا اور اس نوعیت کا تجدیدی کام کیا کہ اگر اس کو سراہا جاتا اور اپنا لیا جاتا اور "مصفیٰ" کی نہج پر کام کیا جانے لگتا جس کی طرف ہمارے اسی شہر کے فقیہ و محدث یعنی مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے قدم اٹھایا تھا اور پھر افراط و تفریط کی آویزش نے انہیں آگے نہ بڑھنے دیا، تو ڈاکٹر اقبال کو یہ نہ کہنا پڑتا ہے

حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق

اور اسلامی علوم کے جوئے شیر کے فرہاد کو بے تاب ہو ہو کر متوجہ کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔

آج بھی عالم اسلامی کے علماء کے سامنے مسائل حاضرہ دست بستہ کھڑے ہیں اور اپنا حل چاہتے ہیں۔ آج کا تجدیدی کام ولی اللہی تجدیدی کام سے دو منزلیں آگے ہے، آج نئے مسائل ہیں اقتصادی دنیا بالکل نئے ساز و سامان کے ساتھ آئی ہے، سیاسی دنیا نے بھی بہت سے نئے چولے بدلے ہیں، بیسوں قسم کے ٹیکس بھی ہیں، زکوٰۃ بھی ہے، بینک بھی ہے، کارخانے، ملیں اور فیکٹریاں بھی۔ بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت بھی نئی ہے۔ حکومت کا ڈھانچہ بھی بہت سی تبدیلیاں رکھتا ہے، تجارت کے لئے نئے اصول وضع کئے گئے ہیں، زرعی نظام بھی بدلا ہے۔ ہسپتال بھی ہیں، پوسٹ مارٹم بھی ہے، ریڈیو بھی ہے ٹیلی ویژن بھی ہے نت نئے مواصلات اور ان کے بین الاقوامی اصول و ضوابط بھی ہیں۔ بھانت بھانت کے ذرائع ابلاغ بھی ہیں اور یہ سب چیزیں ہمارے لئے مسخر بھی ہو چکی ہیں مسخر میدان سے دور ہے اور عزم کر کے جب وہ میدان میں آتا بھی ہے تو اسے سرا نہیں مل پاتا کہ کہاں سے تسخیر شروع کرے اور سب سے بڑھ کر وہ چیلنج جو مغربی، فرانسیسی اور برطانوی قوانین ہیں جو دفعات کی شکل میں مفصل اور واضح طور پر نہایت اپ ٹو ڈیٹ طریقہ میں موجود ہیں اور دنیائے اسلام انہی کے سہارے پر اپنا سیاسی و اقتصادی اور اجتماعی نظام قائم کئے ہوئے ہے۔ اب جب تک موجودہ مغربی قوانین کی شکل میں اسی طرح مفصل، واضح اور اطمینان بخش اور اس سے زیادہ اپ ٹو ڈیٹ طریقہ پر فقہ اسلامی کی تدوین نہ کی جائے گی تو مسلم پرسنل لا تو شاید محفوظ رہ جائے، اسلامی ممالک مغربی قوانین کی جہنم سے نہ نکل سکیں گے۔

اخیر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اجتہاد کا کام گوناگوں نزاکتیں بھی رکھتا ہے۔ اس خار زار وادی میں سنبھل کر قدم رکھنا پڑتا ہے، نفسانیت اور اغراض سے بالاتر ہو کر خوف خدا اور تقویٰ شعاری کے ساتھ تحقیق و کاوش کا حق ادا کر کے حاصل ہونے والے اس نتیجہ کو اجتہاد کہا جائے گا جس پر عقل و ضمیر متفق ہوں۔ علماء اجتہاد کی اجازت دینے سے انہیں نزاکتوں کی وجہ سے ڈرتے ہیں۔ لیکن جہاں مسئلہ موت و حیات کی کشمکش کا ہو وہاں آپریشن کی نزاکتوں کے خوف سے آپریشن ترک کر دینا فہم و دانائی کی بات نہیں۔ اسی طرح جہاں کفر و ایمان، الحاد و بیدینی کا مسئلہ ہو وہاں ان نزاکتوں کو سمجھتے ہوئے اقدام کرنا پڑے گا، لیکن یہ بات ہم علماء کی خدمت میں پوری طاقت اور بلند آہنگی سے کہیں گے اور ان کو توجہ دلائیں گے کہ آپ کی قیادت دینی قیادت ہے اور آج آپ کو اس قیادت کے لئے بلکہ اجتماعی زندگی کی کشتی کو کھینے کے لئے بڑھنا ہوگا اور امت کو موجودہ مشکلات اور مسائل کے بھنور سے نکالنا ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہم اپ ٹو ڈیٹ مولویوں یا عربی کی معمولی شد بد رکھنے والے حضرات سے یہ عرض کریں گے کہ آپ موجودہ دنیا سے زیادہ واقف ہیں اس لئے آپ کی ذمہ داری ہے کہ موجودہ حالات کا مکمل اور واضح تصور علماء کی خدمت میں پیش کیجئے۔ لیکن آپ خود اجتہاد نہ کرنے لگئے، جس طرح موت و حیات کی کشمکش کے باوجود آپریشن ڈاکٹر ہی کرتا ہے لوہار نہیں، اسی طرح کفر و ایمان کی اس کش مکش کا مقابلہ کرنے کے لئے اجتہاد دینی علماء کریں گے جو اجتہاد کے بنیادی شرائط اپنے اندر رکھتے ہوں۔ اصول فقہ کی ہر کتاب میں اجتہاد کے شرائط موجود ہیں جن میں عربی زبان کے فہم پر کامل قدرت، کتاب و سنت سے گہری واقفیت، اجتماعی مسائل، ناسخ و منسوخ اور اجتہادات صحابہ و تابعین و ائمہ مجتہدین کا وسیع علم بھی شامل ہیں۔

علماء سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ کسی رسمی دینی ادارہ یا عربی مدرسہ کے سند یافتہ فارغ التحصیل ہوں بلکہ علماء وہ بھی ہیں جنھوں نے اس علم کی تحصیل کسی راہ سے بھی کی ہو۔ مشرق و مغرب کے کسی بھی ادارہ یا یونیورسٹی میں رہ کر علوم اسلامیہ میں انہوں نے زندگی گذاری ہو، یقیناً وہ علماء ہیں اور انہیں اپنی استعداد کے مطابق تجدیدی کام میں حصہ لینے کا حق پہونچتا ہے لیکن اجتہاد کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ موجودہ دنیا بہت بدل گئی ہے۔ اور اسلام کو اس کے ساتھ چلنا ہے۔ لہٰذا عمل قطع و برید کے ذریعہ اسلام کو عصر حاضر کے چوکھٹے میں فٹ کرنا ہے اور سود سے چارہ کار نہیں اس لئے اس کے جواز کا فتویٰ دینا ہے، انشورنس جس جس طرح رائج ہے اس کے قبول کے بغیر چارہ نہیں اس لئے حیلہ پیدا کرنا ہے مصلحت کے نام پر بنیادی اصول سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔

یہ بات ذہنوں میں صاف ہو جانی چاہئے کہ اگر ایک طرف حقیقی تقاضوں کی اصول شرعیہ کی روشنی میں رعایت ضروری ہے تو دوسری طرف جو غلط نظامہائے زندگی رائج ہو چکے ہیں ان کا قطعی ازالہ کرنا یا ان کے متبادل نظام ہائے زندگی کو رواج دے کر ان کو ... کام سرانجام بھی ضروری ہے۔

شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود

از: مولانا سعید الاعظمی ندوی

۱۷ اکتوبر [illegible] کی صبح کو شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ آکاشوانی نے ۱۸ اکتوبر کی رات کو مجمل خبر نشر کی تھی لیکن بی بی سی ریڈیو نے تفصیل سے خبر سنائی، یوں تو کسی حادثہ کی خبر غیر متوقع نہیں ہونی چاہیے لیکن شیخ الازہر کے انتقال کی خبر معلوم کر کے قدرے تعجب ہوا، اس لئے کہ ان کی صحت ان دنوں اچھی تھی مئی [illegible] میں وہ سخت بیمار ہو گئے تھے اور تقریباً ایک ماہ تک سلسلۂ علالت قائم رہا، اسی زمانے میں ندوۃ العلماء کا ایک دو رکنی وفد مصر میں موجود تھا اور شیخ الازہر کی دعوت پر ان کے مہمان خاص کی حیثیت سے وہ مصر کے نظام تعلیم، وہاں کی علمی اور ثقافتی سرگرمیوں، وہاں کی یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں رائج نصاب تعلیم کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس وفد کے ایک رکن مولانا محمد واضح رشید ندوی ایڈیٹر پندرہ روزہ "الرائد" تھے، راقم الحروف کو بھی اس وفد کی رکنیت کی سعادت حاصل تھی، وفد کا قیام تقریباً ڈیڑھ ماہ قاہرہ میں رہا، اس اثناء میں کئی بار شیخ الازہر سے ملنے اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی عزت حاصل ہوئی، اور ہر دفعہ ان کی پُر اثر شخصیت نے ہمارے دلوں پر ایک گہرا نقش چھوڑا، ہم لوگ ان کی خاکساری، ان کی علمی وجاہت اور ان کی دینداری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اکتوبر [illegible] میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء کے بین الاقوامی جشن تعلیمی کی صدارت انہوں نے بڑی خوشی سے قبول کی تھی۔ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا بہت احترام کرتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اس جشن تعلیمی کی صدارت عالم اسلام کی سب سے بڑی علمی اور پرشکوہ شخصیت شیخ الازہر کریں، چنانچہ شیخ الازہر ازہر شریف اور مصری حکومت کا ایک ۵ رکنی وفد لے کر تشریف لائے اور جشن کی کامیابی میں انہوں نے بڑا رول ادا کیا۔ وہ اس سے پہلے بھی [illegible] میں ہندوستان تشریف لا چکے تھے، اس موقع پر وہ بمبئی، علی گڑھ اور دیوبند گئے، ندوہ کی طرف سے اس وقت بھی ان کو دعوت دی گئی، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی نے اپنا خاص خط دے کر ہم لوگوں کو دہلی بھیجا تاکہ ان کو براہ راست وہ دعوت نامہ دیا جا سکے اور لکھنؤ آنے کے لئے وقت لینے میں دشواری نہ ہو، لیکن شیخ الازہر کا پروگرام بہت زیادہ مشغول تھا وہ دوسرے ہی دن واپس تشریف لے جانے والے تھے اس لئے معذرت کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا، انہوں نے بڑی معذرت کی اور کسی دوسرے موقع سے خاص طور سے ندوہ آنے کا وعدہ فرمایا چنانچہ انہوں نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد جشن کی صدارت کر کے اپنا وہ وعدہ پورا کر دیا۔

اس صدی کے چھٹے دہے میں جب مصر میں کمیونسٹوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور وہ بے تکلف مصر کے مذہبی رنگ کو ختم کرنے کے لئے سارے وسائل استعمال کرنے لگے تھے اور ازہر کو ان کی وجہ سے بڑا خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس وقت شیخ الازہر نے جرأت ایمانی سے کام لے کر ان کی سخت مخالفت کی اور نہ صرف ازہر کو بلکہ پورے ملک کی اسلامی شخصیت کو برقرار رکھنے میں انہوں نے بڑا کردار ادا کیا، وہ نہ حکومت سے ڈرے اور نہ کوئی اور بڑی طاقت ان کی غیرت کو چیلنج کر سکی، یہ تنہا انہیں کی بھاری بھرکم شخصیت تھی جو اس سیلاب پر بند تعمیر کر سکی اور جس نے ازہر کی انفرادیت کو تحلیل ہونے سے بچا لیا۔

شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود بلبیس کے قریب عتیبہ کے مقام پر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے، گھر پر تعلیم کے بعد گاؤں کے مکتب میں قرآن حفظ کیا، اور حافظ ہونے کے بعد جامع ازہر میں داخل ہوئے، ۱۹۳۲ء میں انہوں نے عالمیت کی سند حاصل کی، اور اسی سال اپنے خرچ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے فرانس گئے اور پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں داخلہ لیا، وہاں انہوں نے علم النفس اور علم الاجتماع اور تاریخ مذاہب کے موضوع پر خاص طور سے تیاری کی، اور ان سب مضامین میں اعلیٰ تعلیم کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۳۷ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جامع ازہر کے طلبہ کا جو وفد پیرس گیا تھا اس کے ایک رکن آپ بھی تھے اور اسلامی تصوف میں پی، ایچ، ڈی کیا، ۱۹۴۰ء میں آپ نے "محاسبی" کے اوپر ایک شاندار رسالہ تیار کیا اور اس پر آپ کو اعلیٰ امتیاز کے ساتھ دکتوراہ کی ڈگری دی گئی، ڈاکٹر ہونے کے بعد مصر واپس آ کر عربی زبان کالج میں نفسیات کے استاد ہوئے، اور ۱۹۵۱ء میں فلسفۂ اسلامی کے استاد کی حیثیت سے آپ ازہر کے شریعت کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے، ۱۹۶۴ء میں آپ اسی کالج کے ڈائرکٹر ہوئے اور مصر کے اسلامیاتی تحقیقی ادارہ مجمع البحوث الاسلامیہ کے رکن قرار پائے، اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ اس ادارہ کے سکریٹری جنرل ہو گئے، ۱۹۷۰ء میں ازہر یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ۱۹۷۱ء میں امور مذہبی اور ازہر کے وزیر ہوئے اور ۱۹۷۳ء میں شیخ الازہر کا منصب آپ کو دیا گیا اور اس کے بعد سے برابر آپ اس اعلیٰ عہدہ پر قائم رہے۔

شیخ الازہر نے اس پوری مدت میں جو ازہر کے مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر گذاری، سب سے اہم کام جو انجام دیا وہ تھا ازہر کے گرتے ہوئے مقام و اعتبار کو واپس لانا چنانچہ انہوں نے ازہر کے معیار کو اونچا کرنے اور اس کی اہمیت کو اندر اور باہر ہر جگہ از سر نو قائم کرنے کے لئے بہت محنت کی، اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہے۔ ایک زمانہ میں ازہر کے طلبہ کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی اور باہر کے اسلامی ممالک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی آمد بالکل بند ہو گئی تھی مگر شیخ الازہر نے حالات کو معمول پر لانے اور ازہر کے دروازے علم کی پیاس بجھانے والوں کے لئے کھلوانے میں بڑی مدد کی، چنانچہ ازہر کا معیار تعلیم بہت اونچا ہوا اور لوگ قاہرہ یونیورسٹی کے مقابل میں ازہر یونیورسٹی میں پڑھنے کو ترجیح دینے لگے۔

شیخ الازہر اپنے تعلیمی اور تبلیغی مشن کو پورا کرنے کے لئے لمبے سے لمبے سفر سے بھی گھبراتے نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دنیا بھر کے اسلامی ممالک کے علاوہ یورپ و امریکہ کا بھی بار بار دورہ کیا، وہ ابھی نومبر ۱۹۷۶ء میں امریکہ گئے تھے، اور واشنگٹن میں ہر طبقہ فکر کے لوگوں سے ملاقات کی، اور امریکی صدر جمی کارٹر سے بھی ملے اور اسرائیل اور بیت المقدس کے بارے میں نہایت جرأت اور دلیری کے ساتھ ان سے گفتگو کی اور اپنا موقف ان کے سامنے پیش کیا۔ اسرائیل کے امن معاہدہ کے بارے میں ان کا موقف یہ تھا کہ جب تک فلسطینیوں کے پورے حقوق ان کو واپس نہیں مل جاتے اور اسرائیل عرب سرزمین اور بیت المقدس سے پوری طرح دست بردار نہیں ہو جاتا اس وقت تک اس علاقہ میں امن کا قیام ایک ناممکن سی بات ہے۔

شیخ الازہر نے فکری اور علمی میدان میں بھی بڑا رول ادا کیا ہے، تقریباً ۶۰ کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں جن میں بڑی تعداد مستقل تصنیفات کی ہے اور کچھ ایسی ہیں جن کو انہوں نے ایڈیٹ کیا ہے۔ بعض کتابوں کے نام یہ ہیں، "اسلام میں فلسفیانہ نقطۂ نظر" "مسلمان فلسفی" "یورپ اور اسلام" "ابو الحسن شاذلی" "قرآن، قرآن کے مہینہ ہیں" "حج مبرور" "محاسبی اور عطاء اللہ سکندری" کچھ کتابوں کے فرانسیسی زبان سے ترجمے بھی کئے ہیں جیسے "محمد رسول اللہ" "اخلاقی مسئلہ" "یونانی فلسفہ" "اخلاق اور فلسفۂ جدیدہ" کئی اہم ترین کتابوں کی تحقیق و اشاعت ان کی علمی اور فکری رہنمائی و نگرانی میں ہوئی، یہ کتابیں عظیم اسلامی ورثہ کی حیثیت رکھتی ہیں جیسے سیوطی کی جامع کبیر، اور ذہبی کی تاریخ اسلام، اور بغوی کی مصابیح السنۃ۔

۱۱ اپریل ۱۹۷۶ء کو شیخ الازہر لندن میں پاپائے اعظم "کانٹ بری" سے ملاقات کر کے ان سے اور برطانیہ کے سبھی پادریوں سے فلسطینی پناہ گزینوں پر ڈھائے جانے والے بے پناہ مظالم کو روکوانے کی درخواست کی تھی اور انہوں نے پاپائے اعظم سے یہ کہا تھا کہ یہ مسئلہ صرف سیاسی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک اجتماعی مسئلہ کی بھی ہے جو پوری انسانیت کے لئے چیلنج ہے، انہوں نے توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا کہ اس مسئلہ سے نظریں پھیر لینا اور حق و انصاف کی حمایت نہ کرنا بجائے خود بڑی ناانصافی اور بڑا ظلم ہے۔

عصر حاضر میں جامع ازہر کے لئے جو بنیادی کام انہوں نے تجویز کیا تھا اور جن پر خاص طور سے توجہ دینی تھی وہ یہ تھا کہ:۔

- غیر ممالک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت۔
- اندرون ملک ہر ایسے کردار و عمل کی بھرپور مخالفت جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔
- ایسے عقائد و افکار کے خلاف بھرپور لڑائی جن کا تعلق اسلام سے کسی حال میں نہ ہو جیسے قادیانیت، کمیونزم وغیرہ۔

ان کا مشہور مقولہ ہے کہ، کمیونزم کسی حال میں قابل قبول نہیں ہے اس لئے کہ اسلام سے اس کا تعلق کسی طرح [illegible]

مولانا وجیہ الدین صاحب ندوی رح

از: مولانا سعید الاعظمی ندوی مدیر "البعث الاسلامی"

۱۹ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ مطابق ۲۲ ستمبر ۱۹۷۸ء سنیچر اور اتوار کی درمیانی شب میں رفیق محترم مولانا وجیہ الدین صاحب ندوی ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے، اس کی مصیبتوں، پریشانیوں اور اس کی بے اعتنائیوں سے منہ موڑ کر راہی آخرت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا ادھر ایک عرصہ سے بیمار تھے اور تقریباً ۷ ماہ سے صاحب فراش ہو گئے تھے، ان کو جگر کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا اور لاکھ علاج کے باوجود وہ دور نہ ہوا اور بالآخر وہی ان کا آخری مرض ثابت ہوا، یہ ایک ہفتہ کی مدت میں اہل ندوہ کے لئے دوسرا سنگین حادثہ تھا، ۱۷ اکتوبر کو شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود کے انتقال کی خبر سے فضا سوگوار ہوئی تھی اور ابھی یہ سوگواری پوری طرح دور نہ ہونے پائی تھی کہ ۲۲ اکتوبر کی رات میں یہ واقعہ پیش آیا اور اس نے سب کے دلوں کو غمناک اور آنکھوں کو نمناک بنا کر رکھ دیا۔

مولانا وجیہ الدین صاحب ہردوئی ضلع کے ایک دیہات اسہی اعظم پور کے رہنے والے تھے، اور بچپن ہی میں وہ ندوہ آ گئے تھے۔ انہوں نے ندوہ میں بالکل ابتدا سے تعلیم حاصل کی تھی وہ اس حیثیت سے مکمل ندوی تھے، وہ علم و دین کے لحاظ سے ایک خالص دیندار عالم کی مثال تھے اور اخلاق و ادب کے لحاظ سے ایک سچے اور متواضع و خاکسار تھے، نہ کبھی کسی نے ان کو غصہ کرتے دیکھا، نہ کسی کو جھڑکتے ہوئے پایا، نہ کسی کی شکایت اور برائی کرتے ہوئے سنا، اور نہ اپنی بڑائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کبھی نظر آئے اتنے خاکسار تھے کہ عموماً طلبہ کو بھی بڑا مان کر ان سے بڑے جیسا سلوک کرتے تھے، دینداری میں اپنی مثال آپ تھے، نماز باجماعت کے پابند، شعائر اسلامیہ پر کاربند، اور تلاوت اور نوافل کا اہتمام کرنے والے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ ہر شخص کی نظروں میں محترم و معزز تھے، ان کو لوگوں سے شکایتوں کے بہت مواقع ملے اور بارہا دوستوں نے ان کی خاکساری کی وجہ سے معاملات کے اندر نظر انداز کیا مگر وہ سب کچھ دیکھ کر چپ رہ گئے اور کبھی کسی کی توہین کی نہ انتقام لیا۔

بارہا ایسا ہوا کہ طالب علمی کے زمانے میں ان کے درجے کے ساتھیوں نے کوئی ایسی بات بالاتفاق طے کی جس میں استاذ کی شان میں گستاخی کا شائبہ تھا تو انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس سے الگ تھلگ رہے، کبھی نگراں کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر کمرہ کے ساتھیوں نے ان کو تیار کرنا چاہا مگر وہ راضی نہیں ہوئے، ان وجوہ کی بنا پر بجائے اس کے کہ ان کی عزت کم ہوتی پورے دار الاقامہ میں ان کا احترام بڑھ گیا، دینداری کے ساتھ ان کی سادگی اور بے تکلفی سب کے لئے جاذب توجہ تھی، وہ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے اس زمانے کی روایات کے بالکل برخلاف تھے، کوئی پہلی نظر میں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ندوہ کے طالب علم ہوں گے بلکہ وہ دیہات کے ایک سیدھے سادے نوجوان معلوم ہوتے تھے۔ اکثر اوقات باہر سے آنے والا کوئی مہمان یہ سمجھنے سے قاصر رہتا کہ یہ یہاں کے طالب علم ہیں۔

طالب علمی کے بعد وہ مدرس ہوئے تو ان کے لباس اور وضع قطع میں کوئی فرق نہیں آیا، البتہ شیروانی انہوں نے ضروری سمجھی اور اکثر اسے پہنا کرتے تھے، وہ سادگی کے باوجود بہت خوش مزاج اور دلچسپ تھے، ہر بات میں حصہ لیتے اور اپنی رائے سے نوازتے تھے، وہ ندوی الفکر اور جامع صفات تھے، اقبال کے اشعار ان کو خوب یاد تھے اور موقع سے اسے پڑھتے بھی تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں معتمد بزم خطابت تھے اور تقریر کی خاصی مشق کر لی تھی اس لئے مدرسی کے زمانے میں بھی اکثر سیرت وغیرہ کے جلسوں میں تقریر کرنے جایا کرتے تھے، اور بہت ہی اچھی اور موثر تقریر کرتے تھے۔

وضو کے لئے وہ وضو کا اہتمام بھی کرتے تھے،

ابتدائے مدرسی میں جب تنخواہیں بہت کم تھیں تو تکلیف گوارا کر کے کچھ پیسے بچا لیتے کہ اپنی والدہ صاحبہ کو بھیج سکیں، اس لئے کہ والد صاحب کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اس کے لئے انہوں نے دو ایک ٹیوشن بھی شہر میں کر لئے تھے اور روزانہ پیدل جاتے تھے، کھانے کے معاملہ میں بھی کفایت شعاری ملحوظ رکھتے تھے تاکہ مطبخ کا بل کم آئے تنخواہ کے کچھ پیسے ہاتھ آ جائیں تو ضروریات کے علاوہ وہ اپنے گھر بھیج سکیں، چائے بالکل نہیں پیتے تھے مگر ۱۹۵۳-۵۴ء میں جب وہ میرے کمرہ میں ساتھ رہے تو میری وجہ سے ان کو بھی چائے کی عادت ہو گئی اور آخر تک رہی۔

میں نے ان کو ہمیشہ یکساں حالت میں دیکھا۔ حالات کے اتار چڑھاؤ کے باوجود ان میں کسی طرح کا اتار چڑھاؤ نہیں پیدا ہوا، نہ ان کی تواضع میں فرق آیا، نہ تعلقات میں کمی ہوئی اور نہ وضعداری ترک کی، جس سے جو تعلق تھا وہ آخر تک قائم رہا، تعلقات کو نبھانا ان کی ایک ایسی ادا تھی جو قابل تقلید ہے، شہر میں جن لوگوں سے تعلق قائم ہوا وہ زمانے کے ساتھ ساتھ اسی طرح قائم اور تر و تازہ رہا جس طرح روز اول میں تھا۔

مولانا وجیہ الدین ندوی رح ایک صالح ترین فرد، ایک باخبر عالم دین، اور ایک بااخلاق انسان تھے وہ زمانے کے حالات سے واقف تھے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے، وہ دنیا میں پائے جانے والے نظریات و افکار اور مشرق و مغرب کی کشمکش سے بھی آگاہ تھے، اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک عالم دین کی جو شان ہونی چاہئے اس سے بے خبر نہ تھے۔

افسوس وہ عمر کی اس منزل میں رخصت ہو گئے جب زمانہ کو ان کی ضرورت تھی، ۴۵ سال کی عمر نوجوانی کی عمر ہی شمار ہوتی ہے، ان کے تمام رفقاء اس وقت نوجوان نظر آتے ہیں، اور کسی نہ کسی کام سے لگے ہوئے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ وہ دنیا کے آزار سے نجات پا کر سعادت اخروی کی راہ لیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نیک بندے کے ساتھ بہترین معاملہ فرمایا ہوگا اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دی ہوگی۔

پس ماندگان میں اہلیہ اور ایک بچہ محمد رفیع اور چار بچیاں ہیں، جن میں بھی ہیں جو شادی شدہ ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائیں اور ان کے اہل و عیال اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں اور ہم سب کا خاتمہ ایمان و اطاعت پر فرمائیں۔ (آمین)

"کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام"

بقیہ صـ : فقہ اسلامی کی تشکیل جدید...

سود کی مشکل کا علاج سود کے جواز کا فتویٰ نہیں سودی بنکوں کا خاتمہ اور غیر سودی بنکوں کا قیام ہے سیاسی مصلحتوں کا تابع بن کر اسلامی اصول کا سودا کرنا علاج نہیں۔ حالات کا رخ بدل کر اسلامی اصول کا تابع بنانا علاج ہے۔ حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے علی گڑھ کی کانفرنس میں یہ کہا تھا: "اسلام مرغ باد نما نہیں جو ہوا کا رخ بتاتا رہے" آج ہم پھر اسی حقیقت کو دہراتے ہیں کیونکہ امت اسلامیہ کو ان متجددین سے بھی خطرہ لاحق رہتا ہے جو اسلام کو موڑنا توڑنا کرنے کا نام اجتہاد رکھتے ہیں۔ وہ غلط حالات سے پنجہ آزمائی کی طاقت نہیں تو اسلامی مسائل میں مشکلوں اور دشواریوں کا سہارا لے کر کتر بیونت کرتے رہتے ہیں۔ ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

آخر میں اس جرأت کی معافی چاہتا ہوں، میری یہ معروضات طالبعلمانہ سوالات یا مطالبات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ اس کا جواب اب عملی شکل میں دیا جائے۔

بقیہ صفحہ ۳ ادارتیہ: حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں [illegible]

شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود

از: مولانا سعید الاعظمی ندوی

۱۷ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کی صبح کو شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ آکاش وانی نے ۱۷ر اکتوبر کی رات کو مجمل خبر نشر کی تھی لیکن بی۔ بی۔ سی ریڈیو نے تفصیل سے خبر سنائی، یوں تو کسی حادثہ پر غیر متوقع نہیں ہونی چاہیے لیکن شیخ الازہر کے انتقال کی خبر معلوم کر کے قدرے تعجب ہوا، اس لئے کہ ان کی صحت ان دنوں اچھی تھی، [illegible] میں وہ سخت بیمار ہو گئے تھے اور تقریباً ایک ماہ تک سلسلۂ علالت قائم رہا، اسی زمانے میں ندوۃ العلماء کا ایک دو رکنی وفد مصر میں موجود تھا اور شیخ الازہر کی دعوت پر ان کے مہمان خاص کی حیثیت سے وہ مصر کے نظام تعلیم، وہاں کی علمی اور ثقافتی سرگرمیوں، وہاں کی یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں رائج نصاب تعلیم کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس وفد کے ایک رکن مولانا محمد واضح رشید ندوی ایڈیٹر پندرہ روزہ "الرائد" تھے، راقم الحروف کو بھی اس وفد کی رکنیت کی سعادت حاصل تھی، وفد کا قیام تقریباً ڈیڑھ ماہ قاہرہ میں رہا، اس اثنا میں کئی بار شیخ الازہر سے ملنے اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی عزت حاصل ہوئی، اور ہر دفعہ ان کی پر اثر شخصیت نے ہمارے دلوں پر ایک گہرا نقش چھوڑا، ہم لوگ ان کی خاکساری، ان کی علمی وجاہت اور ان کی دینداری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء کے بین الاقوامی جشن تعلیمی کی صدارت انھوں نے بڑی خوشی سے قبول کی تھی۔ وہ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بہت احترام کرتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اس جشن تعلیمی کی صدارت عالم اسلام کی سب سے بڑی علمی اور پرشکوہ شخصیت شیخ الازہر کریں، چنانچہ شیخ الازہر، ازہر شریف اور مصری حکومت کا ایک ۲ رکنی وفد لے کر تشریف لائے اور جشن کی کامیابی میں انھوں نے بڑا رول ادا کیا۔

وہ اس سے پہلے بھی [illegible]ء میں ہندوستان تشریف لا چکے تھے، اس موقع پر وہ بمبئی، [illegible] اور دیوبند گئے، ندوہ کی طرف سے اس وقت بھی ان کو دعوت دی گئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اپنا خاص خط دے کر ہم لوگوں کو دہلی بھیجا تاکہ ان کو براہ راست وہ دعوت نامہ دیا جا سکے اور لکھنؤ آنے کے لئے وقت لینے میں دشواری نہ ہو، لیکن شیخ الازہر کا پروگرام بہت زیادہ مشغول تھا وہ دوسرے ہی دن واپس تشریف لے جانے والے تھے اس لیے معذرت کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا۔ انہوں نے بڑی معذرت کی اور کسی دوسرے موقع سے خاص طور سے ندوہ آنے کا وعدہ فرمایا چنانچہ انہوں نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد جشن کی صدارت کر کے اپنا وہ وعدہ پورا کر دیا۔

اس صدی کے چھٹے دہے میں جب مصر میں کمیونسٹوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور وہ بے تکلف مصر کے مذہبی رنگ کو ختم کرنے کے لئے سارے وسائل استعمال کرنے لگے تھے اور ازہر کو ان کی وجہ سے بڑا خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس وقت شیخ الازہر نے جرأت ایمانی سے کام لے کر ان کی سخت مخالفت کی اور نہ صرف ازہر کو بلکہ پورے ملک کی اسلامی شخصیت کو برقرار رکھنے میں انہوں نے بڑا کردار ادا کیا، وہ نہ حکومت سے ڈرے اور نہ کوئی اور بڑی طاقت ان کی غیرت کو چیلنج کر سکی، یہ تنہا انہیں کی بھاری بھرکم شخصیت تھی جو اس سیلاب پر بند تعمیر کر سکی اور جس نے ازہر کی انفرادیت کو تحلیل ہونے سے بچا لیا۔

شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود بلبیس کے قریب عتبہ کے مقام پر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے، گھر پر تعلیم کے بعد گاؤں کے مکتب میں قرآن حفظ کیا، اور حافظ ہونے کے بعد جامع ازہر میں داخل ہوئے، ۱۹۳۲ء میں انہوں نے عالمیت کی سند حاصل کی، اور اسی سال اپنے خرچ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے فرانس گئے اور پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں داخلہ لیا، وہاں انہوں نے علم النفس اور علم الاجتماع اور تاریخ مذاہب کے موضوع پر خاص طور سے تیاری کی، اور ان سب مضامین میں اعلیٰ تعلیم کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۳۶ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جامع ازہر کے طلبہ کا جو وفد پیرس گیا تھا اس کے ایک رکن آپ بھی تھے اور اسلامی تصوف میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا، ۱۹۴۰ء میں آپ نے "محاسبی" کے اوپر ایک شاندار رسالہ تیار کیا اور اس پر آپ کو اعلیٰ امتیاز کے ساتھ دکتوراہ کی ڈگری دی گئی، ڈاکٹر ہونے کے بعد مصر واپس آ کر عربی زبان کالج میں نفسیات کے استاد ہوئے، اور ۱۹۵۱ء میں فلسفۂ اسلامی کے استاد کی حیثیت سے آپ ازہر کے شریعت کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے، ۱۹۶۴ء میں آپ اسی کالج کے ڈائرکٹر ہوئے اور مصر کے اسلامیاتی تحقیقی ادارہ مجمع البحوث الاسلامیہ کے رکن قرار پائے، اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ اس ادارہ کے سکریٹری جنرل ہو گئے، ۱۹۷۰ء میں ازہر یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ۱۹۷۱ء میں امور مذہبی اور ازہر کے وزیر ہوئے اور ۱۹۷۳ء میں شیخ الازہر کا منصب آپ کو دیا گیا اور اس کے بعد سے برابر آپ اس اعلیٰ عہدہ پر قائم رہے۔

شیخ الازہر نے اس پوری مدت میں جو ازہر کے مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر گذاری، سب سے اہم کام جو انجام دیا وہ تھا ازہر کے گرتے ہوئے مقام و اعتبار کو واپس لانا چنانچہ انہوں نے ازہر کے معیار کو اونچا کرنے اور اس کی اہمیت کو اندر اور باہر ہر جگہ از سر نو قائم کرنے کے لئے بہت محنت کی، اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہے۔ ایک زمانہ میں ازہر کے طلبہ کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی اور باہر کے اسلامی ممالک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی آمد بالکل بند ہو گئی تھی مگر شیخ الازہر نے حالات کو معمول پر لانے اور ازہر کے دروازے علم کی پیاس بجھانے والوں کے لئے کھلوانے میں بڑی مدد کی، چنانچہ ازہر کا معیار تعلیم بہت اونچا ہوا اور لوگ قاہرہ یونیورسٹی کے مقابل میں ازہر یونیورسٹی میں پڑھنے کو ترجیح دینے لگے۔

شیخ الازہر اپنے تعلیمی اور تبلیغی مشن کو پورا کرنے کے لئے لمبے سے لمبے سفر سے بھی گھبراتے نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دنیا بھر کے اسلامی ممالک کے علاوہ یورپ و امریکہ کا بھی بار بار دورہ کیا، وہ ابھی نومبر ۱۹۷۷ء میں امریکہ گئے تھے، اور واشنگٹن میں ہر طبقۂ فکر کے لوگوں سے ملاقات کی، اور امریکی صدر جمی کارٹر سے بھی ملے اور اسرائیل اور بیت المقدس کے بارے میں نہایت جرأت اور دلیری کے ساتھ ان سے گفتگو کی اور اپنا موقف ان کے سامنے پیش کیا۔ اسرائیل کے امن معاہدہ کے بارے میں ان کا موقف یہ تھا کہ جب تک فلسطینیوں کے پورے حقوق ان کو واپس نہیں مل جاتے اور اسرائیل عرب سرزمین اور بیت المقدس سے پوری طرح دست بردار نہیں ہو جاتا اس وقت تک اس علاقہ میں امن کا قیام ایک ناممکن سی بات ہے۔

شیخ الازہر نے فکری اور علمی میدان میں بھی بڑا رول ادا کیا ہے، تقریباً ۶۱ کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں جن میں بڑی تعداد مستقل تصنیفات کی ہے اور کچھ ایسی ہیں جن کو انہوں نے ایڈیٹ کیا ہے۔ بعض کتابوں کے نام یہ ہیں، "اسلام میں فلسفیانہ نقطۂ نظر" "مسلمان فلسفی" "یورپ اور اسلام" "ابوالحسن شاذلی" "قرآن، قرآن کے صحیفے ہیں" "حج مبرور" "محاسبی اور عطاء اللہ سکندری" کچھ کتابوں کے فرانسیسی زبان سے ترجمے بھی کئے ہیں جیسے "محمد رسول اللہ" "اخلاقی مسئلہ" "یونانی فلسفہ" "اخلاق اور فلسفۂ جدیدہ" کئی اہم ترین کتابوں کی تحقیق و اشاعت ان کی علمی اور فکری رہنمائی و نگرانی میں ہوئی، یہ کتابیں عظیم اسلامی ورثہ کی حیثیت رکھتی ہیں جیسے سیوطی کی جامع کبیر، اور ذہبی کی تاریخ اسلام، اور بغوی کی مصابیح السنۃ۔

۱۱ر اپریل ۱۹۷۶ء کو شیخ الازہر نے لندن میں پاپائے اعظم "کانٹربری" سے ملاقات کر کے ان سے اور برطانیہ کے بھی پادریوں سے فلسطینی پناہ گزینوں پر ڈھائے جانے والے بے پناہ مظالم کو روکوانے کی درخواست کی تھی اور انہوں نے پاپائے اعظم سے یہ کہا تھا کہ یہ مسئلہ صرف سیاسی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک اجتماعی مسئلہ کی بھی ہے جو پوری انسانیت کے لئے چیلنج ہے، انہوں نے توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا کہ اس مسئلہ سے نظریں پھیر لینا اور حق و انصاف کی حمایت نہ کرنا بجائے خود بڑی ناانصافی اور بڑا ظلم ہے۔

عصر حاضر میں جامع ازہر کے لئے جو بنیادی کام انہوں نے تجویز کیا تھا اور جن پر خاص طور سے توجہ دینی تھی وہ یہ تھا کہ:-

- غیر ممالک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت۔
- اندرون ملک ہر ایسے کردار و عمل کی بھرپور مخالفت جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔
- ایسے عقائد و افکار کے خلاف بھرپور لڑائی جن کا تعلق اسلام سے کسی حال میں نہ ہو جیسے قادیانیت، کمیونزم وغیرہ۔

ان کا مشہور مقولہ ہے کہ، کمیونزم کسی حال میں قابل قبول نہیں ہے اسلئے کہ اسلام سے اس کا تعلق کسی طرح نہیں

مولانا وجیہ الدین صاحب ندویؒ

از: مولانا سعید الاعظمی ندوی مدیر "البعث الاسلامی"

۱۹ر ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ مطابق ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۸ء سنیچر اور اتوار کی درمیانی شب میں رفیق محترم مولانا وجیہ الدین صاحب ندوی ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے، اس کی مصیبتوں، پریشانیوں اور اس کی بے اعتنائیوں سے منہ موڑ کر راہی آخرت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا ادھر ایک عرصہ سے بیمار تھے اور تقریباً ۶ ماہ سے صاحب فراش ہو گئے تھے، ان کو جگر کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا اور لاکھ علاج کے باوجود وہ دور نہ ہوا اور بالآخر وہی ان کا آخری مرض ثابت ہوا، یہ ایک ہفتہ کی مدت میں اہل ندوہ کے لئے دوسرا سنگین حادثہ تھا، ۱۷ر اکتوبر کو شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کے انتقال کی خبر سے فضا سوگوار ہوئی تھی اور ابھی یہ سوگواری پوری طرح دور نہ ہونے پائی تھی کہ ۲۲ر اکتوبر کی رات میں یہ واقعہ پیش آیا اور اس نے سب کے دلوں کو غمناک اور آنکھوں کو نمناک بنا کر رکھ دیا۔

مولانا وجیہ الدین صاحب ہردوئی ضلع کے ایک دیہات اسہی اعظم پور کے رہنے والے تھے، اور بچپن ہی میں وہ ندوہ آ گئے تھے۔ انہوں نے ندوہ میں بالکل ابتدا سے تعلیم حاصل کی تھی وہ اس حیثیت سے مکمل ندوی تھے، وہ علم و دین کے لحاظ سے ایک خالص دیندار عالم کی مثال تھے اور اخلاق و ادب کے لحاظ سے ایک سچے اور متواضع و خاکسار انسان تھے، نہ کبھی کسی نے ان کو غصہ کرتے دیکھا، نہ کسی کو جھڑکتے ہوئے پایا۔ نہ کسی کی شکایت اور برائی کرتے ہوئے سنا۔ اور نہ اپنی بڑائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہیں نظر آئے، وہ اتنے خاکسار تھے کہ عموماً طلبہ کو بھی بڑا مان کر ان سے بڑے جیسا سلوک کرتے تھے، دینداری میں اپنی مثال آپ تھے، نماز با جماعت کے پابند، شعائر اسلامیہ پر کاربند، اور ذکر و تلاوت اور نوافل کا اہتمام کرنے والے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ ہر شخص کی نظروں میں محترم اور بے ضرر تھے، ان کو لوگوں سے شکایتوں کے بہت مواقع ملے اور بارہا دوستوں نے ان کو ان کی خاکساری کی وجہ سے معاملات کے اندر نظر انداز کیا مگر وہ سب کچھ دیکھ اور سمجھ کر رہ گئے اور کبھی کسی کی توہین کی نہ انتقام لیا۔

بارہا ایسا ہوا کہ طالب علمی کے زمانے میں ان کے درجے کے ساتھیوں نے کوئی ایسی بات بالاتفاق طے کی جس میں استاذ کی شان میں گستاخی کا شائبہ نکلتا تھا تو انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس سے الگ تھلگ رہے، کبھی نگران کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر کمرہ کے ساتھیوں نے ان کو تیار کرنا چاہا مگر وہ راضی نہیں ہوئے، ان وجوہ کی بنا پر بجائے اس کے کہ ان کی عزت کم ہوتی پورے دار الاقامہ میں ان کا احترام بڑھ گیا، دینداری کے ساتھ ان کی سادگی اور بے تکلفی سب کے لئے جاذب توجہ تھی، وہ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے اس زمانے کی روایات کے بالکل برخلاف تھے، کوئی پہلی نظر میں انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ندوہ کے طالب علم ہوں گے بلکہ وہ دیہات کے ایک سیدھے سادے نوجوان معلوم ہوتے تھے۔ اکثر اوقات باہر سے آنے والا کوئی مہمان یہ سمجھنے سے قاصر رہتا کہ یہ یہاں کے طالب علم ہیں۔

طالب علمی کے بعد وہ مدرس ہوئے تو ان کے لباس اور وضع قطع میں کوئی فرق نہیں آیا، البتہ شیروانی انہوں نے ضروری سمجھی اور اکثر اسے پہنا کرتے تھے۔ وہ سادگی کے باوجود بہت خوش مزاج اور دلچسپ تھے، ہر بات میں حصہ لیتے اور اپنی رائے سے نوازتے تھے، وہ ندوی الفکر اور جامع صفات تھے، اقبال کے اشعار ان کو خوب یاد تھے اور موقع سے اسے پڑھتے بھی تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں معتمد بزم خطابت تھے اور تقریر کی خاصی مشق کر لی تھی اس لئے مدرسی کے زمانے میں بھی اکثر سیرت وغیرہ کے جلسوں میں تقریر کرنے جایا کرتے تھے، اور بہت ہی اچھی اور موثر تقریر کرتے تھے۔

طالب علمی ہی کے زمانہ ۱۹۵۲ء میں ان کو ذہنی تکان کا ایک بار غلبہ ہوا اور عرصہ تک قائم رہا۔ اس نے ان پر بہت برا اثر ڈالا۔ اسی سے اصلاً ان کی صحت متاثر ہوئی۔ اور بجھے بجھے سے رہنے لگے۔ علمی استعداد پختہ ہونے کے باوجود بڑی کتابیں جن میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے پڑھانے سے ایک حد تک گریز کرتے تھے لیکن مشکوٰۃ شریف پڑھانے میں وہ بڑا انشراح محسوس کرتے تھے اور اس کی تیاری مطالعہ کے ذریعہ کر کے پڑھایا کرتے تھے، اور اس کے پڑھانے کے لئے وہ وضو کا اہتمام بھی کرتے تھے۔

ابتدائے مدرسی میں جب تنخواہیں بہت کم تھیں تو تکلیف گوارا کر کے کچھ پیسے بچا لیتے تھے تاکہ اپنی والدہ صاحبہ کو بھیج سکیں، اس لئے کہ والد صاحب کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے دو ایک ٹیوشن بھی شہر میں کر لئے تھے اور روزانہ پیدل جاتے آتے تھے۔ کھانے کے معاملہ میں بھی کفایت شعاری ملحوظ رکھتے تھے تاکہ مطبخ کا بل کم آئے اور تنخواہ کے کچھ پیسے ہاتھ آ جائیں تو ضروریات کے علاوہ وہ اپنے گھر بھیج سکیں، چائے بالکل نہیں پیتے تھے مگر ۱۹۵۳-۵۴ء میں جب وہ میرے کمرہ میں ساتھ رہے تو میری وجہ سے ان کو بھی چائے کی عادت ہو گئی اور آخر تک رہی۔

میں نے ان کو ہمیشہ یکساں حالت میں دیکھا، حالات کے اتار چڑھاؤ کے باوجود ان میں کسی طرح کا اتار چڑھاؤ نہیں پیدا ہوا، نہ ان کی تواضع میں فرق آیا نہ تعلقات میں کمی ہوئی اور نہ وضع داری ترک کی، جس سے جو تعلق تھا وہ آخر تک قائم رہا، تعلقات کو نبھانا ان کی ایک ایسی ادا تھی جو قابل تقلید ہے، شہر میں جن لوگوں سے تعلق قائم ہوا وہ زمانے کے ساتھ ساتھ اسی طرح قائم اور تر و تازہ رہا جس طرح روز اول میں تھا۔

مولانا وجیہ الدین ندویؒ ایک صالح ترین فرد، ایک باخبر عالم دین، اور ایک با اخلاق انسان تھے وہ زمانے کے حالات سے واقف تھے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے، وہ دنیا میں پائے جانے والے نظریات و افکار اور مشرق و مغرب کی کشمکش سے بھی آگاہ تھے، اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک عالم دین کی جو شان ہونی چاہیے اس سے بے خبر نہ تھے۔

افسوس وہ عمر کی اس منزل میں رخصت ہو گئے جب زمانہ کو ان کی ضرورت تھی، ۴۵ سال کی عمر نوجوانی کی عمر ہی شمار ہوتی ہے، ان کے تمام رفقاء اس وقت نوجوان نظر آتے ہیں، اور کسی نہ کسی کام سے لگے ہوئے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ وہ دنیا کے آزار سے نجات پا کر سعادت اخروی کی راہ لیں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نیک بندے کے ساتھ بہترین معاملہ فرمایا ہو گا اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دی ہو گی۔

پس ماندگان میں اہلیہ اور ایک بچہ محمد رفیع اور چار بچیاں ہیں۔ جنمیں بھی ہیں جو شادی شدہ ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائیں اور ان کے اہل و عیال اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں اور ہم سب کا خاتمہ ایمان و اطاعت پر فرمائیں، (آمین)

"کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام"

بقیہ ص: فقہ اسلامی کی تشکیل جدید...

سود کی مشکل کا علاج سود کے جواز کا فتویٰ نہیں سودی بنکوں کا خاتمہ اور غیر سودی بنکوں کا قیام ہے سیاسی مصلحتوں کا تابع بن کر اسلامی اصول کا سودا کرنا علاج نہیں۔ حالات کا رخ بدل کر اسلامی اصول کا تابع بنانا علاج ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے علی گڑھ کی کانفرنس میں یہ کہا تھا: "اسلام مرغ باد نما نہیں جو ہوا کا رخ بتاتا رہے۔" آج ہم پھر اس حقیقت کو دہراتے ہیں کیونکہ امت اسلامیہ کو ان متجددین سے بھی خطرہ لاحق رہتا ہے جو اسلام کو ماڈرنائز کرنے کا نام اجتہاد رکھتے ہیں۔ وہ غلط حالات سے پنجہ آزمائی کی طاقت نہیں تو اسلامی مسائل میں مشکلوں اور دشواریوں کا سہارا لے کر کتر بیونت کرتے رہتے ہیں۔ کہ

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

آخر میں اس جرأت کی معافی چاہتا ہوں، میری یہ معروضات ، بعض سوالات یا مطالبات کی حیثیت رکھتی ہیں، میری یہ خواہش ہے کہ اس کا جواب اب عملی شکل میں دیا جائے۔

بقیہ صفحہ ۳ اداریہ: حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہو گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے مال، اہل و عیال اور اس کی جان سے زیادہ محبوب نہ ہو۔

قربانی کا یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر اللہ کے کچھ بندوں نے پوری انسانیت کی قسمت بدل دی تھی اور اسی حقیقت کو بھلا دیا تھی۔ خدا کی نصرت کے حصول کے لئے آج بھی یہی واحد راستہ ہے۔ اور یہی ایسا راستہ ہے جو مسلم و غیر مسلم ہر قسم کی حکومت میں مسلمانوں کے لئے کھلا ہوا ہے اس راستے میں اکثریت و اقلیت اور آزادی و مجبوری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔!!

لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۶ | ۱۰ نومبر ۱۹۷۸ء | ۸ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ | شمارہ نمبر ۱

چندہ سالانہ

اندرون ملک: بارہ روپے

بیرون ملک: بحری ڈاک جملہ ممالک ڈھائی پونڈ

ہوائی ڈاک

بیرون ملک: مشرق وسطی سعودی عربیہ ایران وغیرہ پاکستان، برما و لنکا سے چار پونڈ

بیرون ملک: ممالک افریقہ سے ساڑھے پانچ پونڈ

بیرون ملک: ممالک یورپ سے سات پونڈ

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے لہذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ دین و ادب کا خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان، آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے تو اس کا سالانہ چندہ مبلغ بارہ روپے ارسال فرمائیے، اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا چندہ یا خط موصول نہ ہوا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی۔ پی بلا سے چندہ ادا کرنے میں سہولت ہے۔ اگلا پرچہ مع وی۔ پی خرچ 15/25 .Rs کے مطالبہ میں وی۔ پی سے روانہ ہوگا چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔

قربانی کے بعد

محمد الحسنی

ذی الحجہ کا یہ مبارک مہینہ جو گذر رہا ہے اپنے اندر ایک خاص پیغام رکھتا ہے۔ اس میں ایک خاص کیفیت پائی جاتی ہے جو ہمیں رمضان کو چھوڑ کر اور دوسرے مہینوں میں نظر نہیں آتی، اس کے پیچھے ایک خاص تاریخ ہے، منفرد اور اپنے رنگ میں مخصوص واقعات ہیں، یہ تاریخیں وہ ہیں جن میں لاکھوں مسلمانوں کے دل کی دھڑکنیں ایک خاص وقت، خاص جگہ اور مخصوص شعائر و ارکان اور ہیئت وصورت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ ان تمام کیفیات کو ہم اگر ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کو "قربانی" کے وسیع و عمیق لفظ سے ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ قربانی کس چیز کی ہے اور کس کے لئے؟

بدقسمتی سے آج "قربانی" کو صرف بکرے اور دنبہ کی قربانی کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے، گویا چند روپے خرچ کر کے ہم قربانی دینے والوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد پھر ہمیں کسی قربانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ قربانی بھی بہت ضروری اور قابل احترام ہے۔ لیکن اس کے بعد یا اس کے ساتھ ایک اور قربانی ہے جو اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے اپنے ایک مضمون میں عرض کیا تھا کہ آج مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے قربانی کا مطلب صرف یہ سمجھ لیا ہے کہ ہر سال حج کر آیا کرو، ولیمہ اور عقیقہ کی شاندار دعوت کر دیا کرو اور بقر عید میں کسی جانور کی قربانی کر لیا کرو، اور اس کے بعد سال بھر چین کی بانسری بجایا کرو، بدقسمتی سے کچھ لوگوں نے اسمیں کچھ اور حرام چیزیں شامل کر لی ہیں اور اسمیں اس فرصت کے فلسفہ کے ساتھ لذت اور تفریح طبع کی بھی آمیزش ہے۔ وہ قبروں پر چادر چڑھاتے ہیں، عرس و قوالی سے لطف اندوز ہوتے ہیں بزرگوں کی قبروں پر میلے لگاتے ہیں، اور گناہ بخشوا کر اور سال بھر کے لئے جنت کی ضمانت لے کر واپس آجاتے ہیں۔

جو لوگ ان بدعتوں سے محفوظ اور ان برائیوں سے دور ہیں، وہ کسی مدرسہ کو چندہ دے کر کوئی سبیل لگوا کر، کسی مسجد میں حافظ کا انتظام کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے لئے جو کچھ قربانی کرنی تھی کر چکے، اب ان کو کسی چیز کی قربانی کی ضرورت نہیں، اس کے بعد ہمیں شکایت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت نہیں آتی اور مسلمانوں کی مدد نہیں ہوتی، یاد رکھئے کہ مدد کا وعدہ بکرے کی قربانی کے ساتھ نہیں بلکہ جذبات کی قربانی اور خواہش کی قربانی کے ساتھ مشروط ہے لن ینال اللہ لحومها ولا دماؤها ولکن یناله التقوی منکم۔

اللہ تعالیٰ کو کچے یا بھنے ہوئے گوشت، لانبے چوڑے دسترخوانوں اور خوشبودار غذاؤں کی طلب نہیں ہے اور یہ چیزیں اس کے پاس نہیں پہونچتیں، اس کے پاس دل کا ادب و لحاظ، خدا کا خوف اور خدا کی محبت اور خدا کے لئے نفس و مال کی قربانی پہونچتی ہے اور اسی میں اس کی رحمت کو متوجہ کرنے کی طاقت ہے

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہمارے لئے صبح سے شام تک دفتروں میں سر کھپانا، رات رات بھر سرکاری ڈیوٹی انجام دینا اور اپنے کاروبار اور اپنے بزنس کی ترقی کے لئے ہر مصیبت کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنا اور ہر تکلیف گوارا کرنا آسان ہے لیکن صبح کے وقت اپنا بستر چھوڑ کر نماز کے لئے اٹھنا مشکل ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ پان، سگریٹ، چائے میں کچھ تاخیر ہو جائے تو ہمیں اذیت ہونے لگتی ہے ہماری پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں اور اگر کسی وقت کی نماز قضا ہو جائے، کسی کی حق تلفی ہو جائے، کوئی ناجائز کام ہم سے سرزد ہو جائے تو ہمیں احساس تک نہیں ہوتا؟

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اپنی ایک ادنیٰ خواہش اور قلبی تقاضہ پر ہم جتنا روپیہ چاہتے ہیں صرف کر دیتے ہیں۔ اپنے موڈ ملاحظہ کی تسکین کے لئے ہر قسم کی فضول خرچی کر گذرتے ہیں۔ اور کسی صحیح مصرف اور ضرورت پر جس کا تعلق آخرت کے ثواب اور خدا کے وعدہ پر ہو چند آنے خرچ کر کے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سارے گناہوں کی تلافی کر دی۔

یہ چند حقائق ہیں، غور سے دیکھا جائیگا تو نظر آئے گا کہ ہماری ساری زندگی اسی قسم کے نمونوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی بری عادتوں کی اصلاح اور اپنی خواہشات کی بندش کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی اور قربانی کی اسی غلط روش پر چلتے رہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

قربانی کی حقیقت یہ ہے کہ پہلے آدمی اپنے ارادہ، اپنی خواہش، اپنی عادت اور اپنے مزاج کے گلے پر چھری پھیرے، اپنے دل کے کہنے پر نہیں خدا اور رسول کے کہنے پر چلنے کا فیصلہ کرے اور اسی قسم کے ہر موڑ پر خدا کے ڈر اور آخرت میں جواب دہی کے خیال سے برائی سے اپنا ہاتھ روک لے اور دل پر پتھر رکھ کر اس سے باز رہے۔ واما من خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهوی فان الجنة هی المأوی۔

جو کوئی ناجائز آواز خواہ وہ کتنی میٹھی اور رسیلی ہو محض اس لئے نہ سنے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے، کسی غلط چیز سے خواہ وہ بار بار اس کے سامنے آئے محض اس لئے نگاہیں پھیر لے کہ یہ حکم الہی کی خلاف ورزی ہے، جو دوستوں کی محفل، اپنی ساری دلچسپی کے باوجود محض اس لئے اٹھ آئے کہ اس میں غیبت و عیب جوئی ہو رہی ہے، جو اپنے گھر والوں کے غلط اور ناجائز مطالبات ان سے اپنی محبت و تعلق کے باوجود محض اس لئے رد کر دے کہ اس میں احکام شریعت سے سرتابی اور معصیت کا ارتکاب ہے، اپنے والدین اپنے بھائیوں اور اپنے قریب ترین عزیزوں کے خلاف ان کی محبت اور شرم کے باوجود انصاف کی گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے۔

اس سے کم درجہ یہ ہے کہ جہاں وہ دن رات میں اپنی سیکڑوں خواہشات پوری کرتا ہے اور اپنے نفس کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے ہر قسم کی قربانی پر آمادہ ہو جاتا ہے وہاں وہ کسی وقت اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لانے، اسکے در رحمت پر دستک دینے اور اس کی نظر کرم کو متوجہ کرنے پر بھی صرف کرے اور اسی کے لئے اپنے نفس اور مال اور اپنی خواہش اور عادت کی بھی تھوڑی بہت قربانی پیش کرے۔

وہ کم از کم بڑے گناہوں سے بچے، غیبت، خیانت، جھوٹ، بدنگاہی اور فرائض میں کوتاہی سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے اور اس راہ میں اگر اس کو اپنے اوقات اور اپنی عادات کی کچھ قربانی کرنی پڑ رہی ہو تو اس سے بالکل دریغ نہ کرے۔

قربانی کی یہ صحیح تصویر ہے جس پر خدا کی نصرت کا وعدہ ہے۔ اس قربانی میں کوئی تقسیم نہیں یہ جانور کی قربانی سے لے کر اپنے نفس کی قربانی تک محیط ہے۔ بلکہ جانوروں کی یہ قربانی دراصل اسی نفس کی قربانی کا عکس، اسی کی تمثالی تصویر اور اس کا مادی پیکر ہے، اور جانور کی قربانی کا کیا ذکر، حضرت اسماعیل جیسی ہستی کی قربانی کا حکم اور اشارہ اسی لئے تھا کہ اس محبت کی قربانی ہر جگہ چاہنے والے باپ کے دل میں اپنے محبوب فرزند کے لئے موجود ہوتی ہے۔

قربانی کی حقیقت اور اس کی روح (خواہ وہ وقت کی قربانی ہو یا مال کی یا خواہشات کی ہو یا جان کی) یہ ہے کہ آدمی خدا کے ڈر کے سامنے ماحول، سماج اور حکومت کا ڈر، اور خدا و رسول کی محبت کے سامنے انسانوں کی محبت، دولت کی محبت، جاہ کی محبت اور دوسری تمام محبتوں سے دستبردار ہو جائے۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

از مولانا محمد اویس نگرامی ندوی

تعلیم القرآن

اولیاء اللہ

ان اولیاء اللہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون الذین آمنوا وکانوا یتقون ۰

یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں پر قیامت کے دن نہ خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں۔

جو لوگ اللہ کی اطاعت اور رسول کی پیروی کے ذریعے اللہ کے پیارے بن جاتے ہیں وہ اس کے ولی کہلاتے ہیں؛ اللہ کے ولی کی پہچان یہ ہے کہ وہ دین کا پیرو ہو خدا اور رسول کی ہر بات مانتا ہو۔ خدا نے فرمایا۔

ان اولیاؤہ الا المتقون ۰ (انفال) تقوی والے ہی خدا کے دوست ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرا دوست اللہ اور نیک کام کرنے والے مسلمان ہیں"

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے اللہ کی محبت کا دعویٰ کیا، تو ان کے امتحان کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ۰

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

مطلب یہ ہے کہ رسول کی پیروی ایک کسوٹی ہے جو اس پر پورا اترا وہ اللہ کا ولی ہے اور جو اس سے الگ ہے اس کو ہرگز ہرگز اللہ کا ولی نہ سمجھو اس کی باتوں پر بھروسہ نہ کرو اور اس سے اپنا دل نہ لگاؤ۔

حضرت جنید بغدادیؒ ایک بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں، انہوں نے فرمایا، مخلوق پر تمام راستے بند ہیں، سوا اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر چلے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "میں تمہیں خدا کے تقویٰ اور شریعت کی پابندی کی وصیت کرتا ہوں"

حضرت خواجہ محمد معصومؒ بھی ایک بڑے بزرگ گذرے ہیں، انہوں نے کہا کہ "جس کا عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے اور نہ وہ شریعت کا پابند ہے اس سے دور رہو" فرمایا "نجات کا معاملہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی میں ہے"

اللہ کا ولی وہی ہے جو دین پر عمل کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو ہے اور جو ایسا نہیں ہے وہ اللہ کا ولی نہیں ہے۔

اچھی صحبت

واتبع سبیل من اناب الیّ (لقمان) اور جو میری طرف مائل ہوا اسکی راہ چلو

اچھے آدمیوں کی صحبت آدمی کو اچھا بنا دیتی ہے، اسی لئے خدا نے فرمایا کہ جو لوگ میری طرف مائل ہیں، میری عبادت کرتے ہیں، اور میری بات مانتے ہیں تم بھی انکی پیروی کرو اور ان کا ساتھ اختیار کرو۔

اچھے اور نیک آدمیوں سے ملنا بھی نیکی اور ثواب کا کام ہے، حضورؐ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی نیک بندے سے ملنے کے لئے چلتا ہے تو ایک پکارنے والا آواز لگاتا ہے "تو بھی اچھا ہے اور تیرا چلنا بھی مبارک ہے تو نے اپنا گھر جنت میں بنا لیا"

حضرت عمرؓ مدینہ سے کسی قدر دور رہتے تھے اس لئے روزانہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکتے تھے اس لئے یہ کرتے تھے کہ ایک دن خود آتے تھے اور دوسرے دن اپنے اسلامی بھائی حضرت عتبانؓ کو بھیجتے تھے، تاکہ ان کے ذریعہ حضورؐ کی باتیں معلوم ہو جائیں۔

قرآن کا ادب

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگاؤ اور چپ رہو

قرآن پڑھا جائے تو دو باتوں کا خیال رکھو، ایک تو یہ کہ چپ رہو، دوسرے یہ کہ اس کی طرف کان لگائے رہو، تاکہ مطلب ذہن میں آئے؛ اگر معنی نہیں سمجھتے ہو تو ادب کے ساتھ قرآن سننے کا ثواب تو مل ہی جائے گا۔

تمہارے سامنے کسی حاکم کا حکم پڑھا جائے تو خاموش ہو کر غور سے سنو گے؛ اسی طرح خدا کے (قرآن) حکم اس سے بڑا حاکم کون ہے؟

محسن انسانیت نے فرمایا

عدل و حکمت

★ جو باوجود قدرت انتقام غصہ ضبط کر جائے، خدا اس کے قلب کو طمانیت سے معمور کر دیتا ہے۔

★ سب سے زیادہ متحمل وہ ہے جو دشمن کو گرفت میں لانے کے بعد عفو و درگذر سے کام لے۔

★ اگر کسی کو غصہ آجائے تو اسے چاہئے سکوت اختیار کرے۔

★ جس میں رفق و لینت (مہربانی و نرمی) نہیں وہ گویا تمام خوبیوں سے محروم ہے۔

★ یہ مت کہو کہ لوگ ہم سے اچھا برتاؤ کریں گے تو ہم ان سے اچھا برتاؤ کریں گے وہ زیادتی کریں گے تو ہم بھی زیادتی کریں گے، بلکہ اپنی ایسی روش بناؤ کہ لوگ تم سے اچھا برتاؤ کریں تو تم ان پر احسان کرو اور اگر وہ تم سے برائی کریں تو عفو و درگذر سے کام لو۔

★ برائی کا جواب بھلائی سے دو۔ نیکی کی قوت سے بدی کی قوت پر غلبہ حاصل کرو۔

★ برے لوگ اپنی برائیوں سے باز نہیں آتے تو اچھے اپنی اچھائیاں کیوں چھوڑیں۔

★ نیک ہمنشین کی مثال مشک والے کی سی ہے تجھے اس سے کچھ نہ ملے گا تو خوشبو تو ضرور پہنچے گی۔ برے ہمنشین کی مثال لوہے کی بھٹی کی ہے۔ اگر سیاہی نہ لگی تو دھواں تو ضرور پہنچے گا۔

★ جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔

★ قابل رشک وہ ہے جسے مال دیا گیا اور مال کو مناسب طریقہ پر خرچ کرنے کی توفیق بھی عطا ہوئی۔ قابل رشک وہ ہے جسے عقل بخشی گئی اور وہ اس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتا ہے۔

★ نعمت ایک وحشی جانور ہے اسے شکر کی زنجیروں میں باندھ کر رکھو۔

★ ایسی نعمت کسی کو نہیں دی گئی جو صبر سے بہتر اور عظیم الشان ہو۔

★ عبادت میں زیادتی اپنی طاقت کا لحاظ کر کے کرو۔

★ صحت کی حالت میں نیک کام کرنا، بیماری کے زمانہ کے صدقہ و خیرات سے افضل ہے۔

★ دانا وہ ہے جو اپنے کو چھوٹا سمجھتا ہے اور وہ کام کرتا ہے جو مرنے کے بعد کام آئے۔

★ تدبیر جیسی کوئی دانائی نہیں۔

★ تواضع سے درجہ بلند ہوتا ہے۔

★ تہمت کے مواقع سے بچو۔

★ دنیا کو چھوڑ دو تاکہ وہ تمہاری طرف رغبت سے آئے۔

★ مجلسیں امانت سے قائم ہیں۔

★ بہتر توشۂ آخرت پرہیزگاری ہے۔

★ محبت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔

★ جو کچھ تمہارے حصے میں آئے اس پر قانع ہو جاؤ تو تم تونگر ہو جاؤ گے۔ تمہارا دل غنی ہو جائیگا۔

★ نیک بخت وہ ہے جو دوسرے سے نصیحت پکڑے۔

★ آدمی اس کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

★ جب تم میں سے کوئی اپنے سے مالدار کی طرف دیکھے تو اسے چاہئے کہ اپنے سے غریب کی طرف بھی دیکھے۔

★ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ جو چیز اس کے لئے فائدہ رساں نہ ہو اسے ترک کر دے۔

★ اچھا آدمی مانند ان سو اونٹوں کے جن میں سے ایک ہی سواری کے لائق ہوتا ہے۔

★ زیادہ گوئی سے بڑھ کر کوئی چیز آدمی کے لئے بری نہیں۔

★ جسے اس کے عمل نے پیچھے کی صف میں ڈھکیل دیا نسب اسے اگلی صف میں نہیں لا سکتا۔

★ میرے پاس حسب نسب لے کر نہیں اعمال لے کر آؤ۔

★ خدا کے نزدیک اچھا عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے چاہے وہ تھوڑا ہی ہو۔

★ جب رشوت دروازے سے داخل ہوتی ہے تو امانت کھڑکی کی راہ نکل جاتی ہے۔

★ تعلیم دو، آسانی کا لحاظ رکھو، دشواری نہ پیدا کرو۔

★ خوشحالی زندگی گذارنے کا نام تکبر نہیں، تکبر دوسروں کو حقیر جاننے اور سچائی کو رد کر دینے کا نام ہے۔

★ آدمی آپس میں ایسے ہیں جیسے کنگھی کے دندانے۔

★ دنیا میں اس طرح زندگی گزارو گویا تم پردیسی ہو۔

★ آدمی اکثر گناہوں کا مرتکب زبان کی وجہ سے ہوتا ہے۔

★ بلا اکثر بولنے سے آتی ہے۔

★ ابھی لوگ سو رہے ہیں۔ مرتے ہی جاگ اٹھیں گے۔

★ مال کو زائد از ضرورت وہ جمع کرتا ہے جس کی عقل کمزور ہے۔

ہم نے جو کچھ کھویا ہے اندر کھویا ہے، اور اس کو تلاش باہر کر رہے ہیں

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

"پیام انسانیت" کے موضوع پر ایک روح پرور تقریب مدرسہ عربیہ سراج العلوم کے زیر اہتمام کوٹھی نشاط افزا کے وسیع سبزہ زار پر ۱۶ر اپریل کی شب میں منعقد ہوئی۔

"پیام انسانیت" کے موضوع پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو تقریر فرمانی تھی، جلسے کے مہمان خصوصی، ریاستی وزیر تعلیم، مسلم اوقاف و اردو الحاج غلام سرور صاحب تھے، جلسہ کی صدارت عالمی شہرت کے حامل، ممتاز تاریخ داں ڈاکٹر بی بی مسرا فرما رہے تھے، جلسہ کے کنوینر جناب ایم اے ناظم مدرسہ عربیہ سراج العلوم سیوان، جناب منان احمد ایڈوکیٹ اور ڈاکٹر بی این سنہا تھے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر احمد جمال پاشا نے انجام دیے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس جلسہ میں شرکت کے لیے مونگیر کانفرنس سے سیوان تشریف لائے تھے۔ مولانا کے آنے کی خبر ہر طرف پھیل گئی تھی۔ ریاست بہار اور یوپی کے متعدد اضلاع، قصبات اور مواضعات سے جلسہ میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، جو ٹرینوں، بسوں اور مختلف گاڑیوں کے ذریعہ شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ بیس ہزار سے زائد مسلم، ہندو، سکھ اور عیسائی خواص و عوام انتہائی احترام اور عقیدت کے ساتھ، ان معزز و محترم ہستیوں کو سن رہے تھے۔ مجمع بڑھتا ہی جاتا تھا اور حد نگاہ تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ جلسہ میں اول سے آخر تک اتنا سکون رہا کہ (Pin drop silence) جو اتنے بڑے جلسوں کی تاریخ میں ایک نادر بات ہے۔

علی میاں نے فرمایا:

صدر محترم، گرامی منزلت، جناب غلام سرور صاحب وزیر تعلیم، مولانا نظام الدین صاحب، مولانا عبدالرحمن صاحب نائب امیر شریعت، معزز ین شہر اور میرے بھائیو!

انسانیت پر اعتماد:

سب سے پہلے تو میں آپ کے سامنے اپنی اس خوشی کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں، اور یہ انسان کی خوبی ہے اس کی کمزوری نہیں ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ خوش ہوتا ہے تو اپنی خوشی ظاہر کرتا ہے، اور اس کو اپنی خوشی ظاہر کرنا چاہیے، یہ بالکل مصنوعی (Artificial) بات ہے کہ آدمی خوش ہو اور خوشی ظاہر نہ کرے۔ بعض مرتبہ یہ کہنا کہ "ہم بہت خوش ہوئے ہیں"، یہ چھوٹی بات سمجھی جاتی ہے لیکن میں اس کو زندگی کی علامت سمجھتا ہوں، مردہ اپنی خوشی ظاہر نہیں کر سکتا، نہ اپنا رنج ظاہر کر سکتا ہے، لیکن جب تک انسان زندہ ہے اور اس کی رگوں میں خون پھر رہا ہے، اور سانس آ رہی اور جا رہی ہے اس وقت تک وہ باہر کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، جب روح نکل جاتی ہے جسم و جان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر باہر کے حالات کا کوئی اثر نہیں پڑتا، کوئی سایہ نہیں پڑتا، اس لیے میں آپ سے اپنی خوشی چھپا نہیں سکتا۔ اور اس پر میں کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں کرتا کہ اس مجمع کو دیکھ کر بہت خوش ہوں انسان کے لئے بڑی دل توڑنے والی باتیں پیش آتی ہیں اور زندگی نام ہی اس کا ہے دل توڑنے والی باتیں بھی پیش آتی ہیں۔ دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے واقعات بھی پیش آتے ہیں۔ شیشہ کی طرح، کانچ کی طرح، دل کے سو ٹکڑے، ہزار ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے والے واقعات بھی پیش آتے ہیں اور زندگی ان دونوں کا مجموعہ ہے، ان ہی کے تال میل سے اسی تانے بانے سے، تکلیف دہ اور خوش کرنے والے واقعات دونوں سے یہ زندگی بنی ہے تو کسی انسان کے لئے، اس سے زیادہ دل توڑ دینے والی، اس سے زیادہ اس کا حوصلہ پست کر دینے والی بات، اس سے زیادہ اس کو بجھا ہوا بنا دینے والی بات نہیں ہے کہ اس کی بات کو سننے والا، اس کی بات کا کوئی سمجھنے والا نہ ہو، سب سے بڑی سزا انسان کے لئے یہ ہے کہ آپ اس کو کہیں جنگل میں ڈال آئیے، پہاڑ کی چوٹی پر بٹھا دیجئے، جہاں وہ روئے تو کوئی دیکھنے والا نہ ہو، وہ ہنسے تو کوئی دیکھنے والا نہ ہو، سوائے اس کے پیدا کرنے والے کے کوئی انسان نہ اس کی بات سننے والا ہو نہ اس کا غم غلط کرنے والا ہو، نہ اس کو تسلی دینے والا ہو، نہ اس کے درد کو سمجھنے والا ہو، اس سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی چیز دل خراش، دل شکن اور حوصلہ [illegible] نہیں ہو سکتی، اس کے مقابلہ میں آپ انسان سے سب چھین لیجئے، لیکن انسانوں کی ہمدردی اس کو حاصل ہو، انسان اس پر بھروسہ کرتے ہوں تو اس کو سب مل گیا، سب دولت مل گئی، یہ ہماری شعر و شاعری، لٹریچر، پوئٹری، فنون لطیفہ، فائن آرٹس، [illegible] Talent فلاسفی اور ٹکنالوجی تک جو جمادات پر صرف ہوتی ہے Instruments پر صرف ہوتی ہے، سب کا سرچشمہ، سب کو پیدا کرنے والی چیز امید ہے، انسان کو امید ہوتی ہے، میں ایک شعر کہوں گا تو اس کو کوئی سننے والا، سر دھننے والا ہو گا، آرٹسٹ ہے تصویر بناتا ہے، بڑا مخلص Sincere ہے، اس کو اس کی پرواہ نہیں کرنا چاہیے کہ لوگ تعریف کرتے ہیں یا تنقید کرتے ہیں، اس کو داد دینے والے ہیں، یا اس کی محبت پر پانی پھیر دیتے ہیں، لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میری تصویر کا کوئی دیکھنے والا اور اس کے خط و خال کا کوئی سمجھنے والا نہیں ہے تو اس کا قلم، اس کا دماغ نہیں چلے گا، اس کے اندر جو قابلیت ہے تصویر بنانے کی وہ بجھ کر رہ جائے گی یہ جو کچھ ہمارے علم و ادب کا ذخیرہ ہے، یہ لائبریریاں ہیں یہ سب اسی قدردانی کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے صدر بھی ایک بڑے مصنف ہیں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کی ہابی (Hobby) ان کا سب سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ لکھنا پڑھنا ہے میں ان کو گواہ بناؤں گا اور آپ کے سامنے ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ ان کی کتابوں کے پڑھنے والے نہیں ہیں، Admirers ہونا تو الگ بات ہے کتابوں کے پڑھنے والے بھی نہیں ہیں میں نہیں سمجھتا کہ ان کا قلم چلے گا، قلم کو جو چلانے والی چیز ہے وہ مصنف کا تصور ہے میں اکیلا نہیں ہوں انسان کے لیے سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں اکیلا ہوں، اسی وقت اس کا دم گھٹنے لگے گا، انسان کو خدا نے اکیلا پیدا بھی نہیں کیا، اور اکیلا رکھا بھی نہیں اور خدا کا یہ منشا بھی نہیں ہے کہ وہ اکیلا رہے، اگر خدا کو اس کو اکیلا رکھنا ہوتا تو اس کو پہاڑ بنا دیتا پتھر بنا دیتا، ہیرا بنا دیتا، کانوں میں کتنے ہیرے پڑے ہوتے ہیں، جواہرات پڑے ہوتے ہیں، لیکن انسان کو خدا نے انسانوں کے بیچ میں پیدا کیا، اور انسان کی فطرت ہے کہ وہ آدمیوں میں رہنا چاہتا ہے اس کو کاٹنے دوڑتا ہے، جیل خانہ بن جاتا ہے وہ اس میں اکیلا ہو، جیل خانہ کی کیا تعریف ہے، جیل خانہ میں کس بات کی کمی ہے، ہمارے منسٹر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہماری حکومت ہے، ہمارے دیش کی حکومت ہے آجکل جیل میں ساری آرام کی باتیں ہیں اسپیشل کلاس ہوتے ہیں، وہاں پر بعض مرتبہ وہ آسائش وہ اکرام میسر ہوتا ہے جو اچھے اچھے لوگوں کو اپنے گھر پر میسر نہیں آتا، لیکن جیل خانہ کیوں معلوم ہوتا ہے، کیوں لوگ اس سے گھبراتے ہیں، قیدی ملنا چاہتا ہے مل نہیں سکتا، بات کرنا چاہتا ہے تو بات کرنے کے لئے اسے نہیں ملتے، اس کا دم گھٹنے لگتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ، ؏

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

میں استاد بھی رہا ہوں اور اس پر فخر کرتا ہوں، بچے کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ اس سے کہا جائے، "یہاں بیٹھے رہو، کہیں جانا نہیں، اٹھنا نہیں"، بچے کو آپ دو تھپڑ مار لیجیے، چار تھپڑ مار لیجیے تھوڑی دیر میں خوش ہو جائے گا، لیکن بچے سے کہئے دو گھنٹے یہاں بیٹھے رہو، تو بچے کو یہ معلوم ہو گا کہ اب جان نکل جائے گی کیوں؟ اس کو کیا تکلیف ہے؟ یہ ہے کہ انسانی فطرت حرکت چاہتی ہے، بات کرنا چاہتی ہے، تو انسان اپنے کو اکیلا محسوس کرے، اتنی ہی بات انسان اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے، اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، جیسے مچھلی کو آپ پانی سے نکال کر خشکی میں ڈال دیجئے تو مچھلی کا دم گھٹنے لگے گا۔

میں آپ سے صاف کہتا ہوں، کہ پڑھے لکھے آدمیوں، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی بھائیوں کی اتنی صورتیں دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا خون بڑھ گیا ہے،

ہماری فطرت خراب نہیں اوپر کی چیزیں خراب ہیں:

دنیا کا کارخانہ اعتماد اور بھروسے ہی پر چل رہا ہے، اتنے بھائی امید لے کر اور اطمینان کر کے آئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری فطرت خراب نہیں ہوئی، ہمارے اوپر کی چیزیں خراب ہو گئیں، ہمارا Conscience اتنا خراب نہیں جتنی زبان خراب ہوئی ہے، اور مجھے کہنے کی اجازت دیجئے جتنا ہمارا دماغ خراب ہوا ہے، اور یہ جو کچھ خرابی آج دنیا میں دیکھ رہے ہیں زیادہ تر دماغ کی خرابی کا نتیجہ ہے ہم نے غلط پڑھا غلط نتیجہ نکالا ہے، ہم نے دنیا کا غلط مطلب سمجھا ہے، ہمارا ضمیر سو گیا ہے جگانے سے جاگ سکتا ہے۔

میں ابھی چار اسٹیٹس States کا دورہ کر کے آ رہا ہوں، میں نے دیکھا کہ خدا نے کتنا بڑا ملک ہم کو دیا ہے اور کیسا سرسبز اور شاداب ملک دیا ہے، ہمارا سر اونچا ہے کہ ہمارا ملک کسی حیثیت سے کسی ملک سے کم نہیں ہے، کیسی ہریالی، کیسی شادابی، کیسی پیداوار، کیسے خوبصورت مناظر، کیسا قدرتی حسن، کیسے اونچے پہاڑ، دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہماری زمین پر ہے، بہت لمبے دریا ہمارے ملک میں بہتے ہیں اور غلہ کتنا پیدا ہوتا ہے، پھل کیسے کیسے خدا نے پیدا کیے اور ان سب سے بڑھ کر آدمیوں کی آبادی، یہ آدمیوں کا جنگل ہے، کھوے سے کھوا چھلتا ہے، بازاروں میں نکلنا مشکل ہے، ٹریفک کنٹرول کرنا مشکل ہے۔

محبت و اعتماد کا راستہ:

ہمارے ملک میں کوئی کمی نہیں، لیکن ہمارے ملک کے اندر احساس ذمہ داری، شہریت کا احساس (یہ احساس کہ ہم ایک شریف اور ذمہ دار شہری ہیں) پورے طور پر نہیں ہے، محبت کی کمی ہے اعتماد کی کمی ہے، لوگ ڈرے ہوئے سے ہیں، آدمی مطمئن نہیں ہیں، یہ اطمینان نہیں کہ کس وقت کیا ہو جائے، یہ بے یقینی کی حالت (جو معاف کیجئے گا) ہماری سیاسی پارٹیوں نے، پچھلی حکومتوں نے پیدا کی ہے، اس سے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے، یہ ساری خرابی ہماری ہے، خدا کی طرف سے کوئی کمی نہیں، نہ آسمان نے کمی کی پانی برسانے میں، نہ زمین نے کمی کی غلہ اگانے میں، تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے، اور ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہمارا ہندوستان اپنی ذہانت میں، اور اپنی Intelligence میں، اپنی کارکردگی کی صلاحیت میں، اپنی سوجھ بوجھ میں، اور اپنی طبعی خرافت [illegible] دنیا کے کسی ملک کے کسی شہری سے کم نہیں، لیکن اس سے [illegible] فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے جس حد تک اٹھایا [illegible] سکتا تھا، اور اٹھایا جانا چاہیے، کسی آدمی کے پاس کوئی چیز نہ ہو تو ذرا تسلی ہوتی ہے کہ بھئی نہیں ہے، خدا نے نہیں دی ہے، غریب آدمی ہے اس کو تسلی ہے میں غریب گھر میں پیدا ہوا۔ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں، میں ذہین بھی نہیں ہوں، میں نے محنت بھی نہیں کی ہے، وہ اپنی قسمت پر راضی ہوتا ہے، لیکن جس کو خدا نے سب کچھ دیا ہو اور پھر وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے تو رہ رہ کر اس کو یہ خیال آتا ہے، دل مسوس کر رہ جاتا ہے، کہ میں کیوں نہیں فائدہ اٹھاتا، مجھے کیوں اس کا موقع نہیں ملتا اس کا جو صحیح نتیجہ ہے، وہ مجھے کیوں نہیں حاصل ہوتا ہے یہی احساس میرا ہے میں ہندوستان میں آپ سب لوگوں سے زیادہ پھرنے والا آدمی ہوں، میرے ایسے ہی حالات ہیں، میں ہندوستان کے چپہ چپہ پر گھوما اور کونہ کونہ تک پہونچا ہوں، کتنا دولت مند ملک، زمینی پیداوار سے بھی، معدنی پیداوار سے بھی یہاں بہتر سے بہتر دھاتیں پائی جاتی ہیں، اور اس میں آپ کے اسٹیٹ بہار کا تو نمبر اول ہے، کوئلہ سب سے زیادہ یہاں نکلتا ہے۔ لوہا یہاں پیدا ہوتا ہے، کیسے بڑے بڑے کارخانے اور پھر ریفائنریز یہاں قائم ہیں، پٹرول چاہے باہر سے آئے لیکن یہاں ریفائن ہوتا ہے، یہاں سے وہ تمام ہندوستان میں تقسیم ہوتا ہے، کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن فسادات یہاں ہوتے ہیں، بھائی بھائی کا یہاں دشمن بن جاتا ہے، پاگل پن کی لہر اٹھتی ہے، کوئی شریر آدمی ایک نعرہ لگا دیتا ہے اور سارے کا سارا ملک اس وقت ایسا مست ہو جاتا ہے جیسے اس کو کسی نے انجکشن دے دیا، یا اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا، طالب علم، طالب علم معلوم نہیں ہوتے، پروفیسر، پروفیسر معلوم نہیں ہوتے، اسکالر، اسکالر معلوم نہیں ہوتے، میں جمشید پور، راؤرکیلا، رانچی گیا ہوں، اور فسادات کے بعد گیا ہوں، یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہی نہیں ہوا حیرت بھی ہوئی کہ آخر انسان کو کیا ہو جاتا ہے، یہ انسان اتنی جلدی جانور کیسے بن جاتا ہے، اسے بھی جانور کو انسان بننے کے لئے بڑی مشکل پیش آتی ہے لیکن انسان کو جانور بن جانے کے لئے کوئی مشکل نہیں، چاہیے تو یہ تھا کہ جانور کے لئے انسان بننا آسان ہوتا، انسان کے لئے جانور بننا مشکل ہوتا، اس لئے کہ اگر جانور انسان بن جائے تو بڑی اچھی بات ہے ہم نے کچھ Gain کیا، ہم نے کچھ پایا، لیکن انسان اگر جانور بن جائے اس سے بڑھ کر ہماری بدقسمتی نہیں ہو سکتی، ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تو انسان، ماں باپ نے انسان کا بچہ سمجھ کر پالا پوسا، ساری غذائیں انسانوں کی دیں اور اس کے بعد جب پڑھنے کے قابل ہوا تو پڑھنے بٹھا دیا گیا، اس کے سامنے نمونے اچھے اچھے آئے، پرانی ہسٹری آئی تو اچھی آئی، پرانے واقعات آئے تو اچھے آئے، ہر ماں باپ، ہر خاندان کے والدین خواہ کم پڑھے لکھے ہوں لیکن وہ اپنے بچے کو اچھے سے اچھا بنانا چاہتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے، اس بنا پر انسان نے بڑی ترقی کی ہے، والدین کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ ہمارا بچہ ہم سے بڑھ جائے، انسان کسی کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا، لیکن اپنے بچے کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھنا چاہتا ہے، یہ انسان کی فطرت ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک نسل پہلی نسل سے اچھی ہوتی ہے، اور تیسری نسل دوسری نسل سے اچھی، تو انسان پیدا ہوا تو انسان تھا، اس کے بعد جب اس کو دودھ پلایا گیا تو انسان کے بچے کی طرح پلایا گیا، گودوں میں کھلایا گیا، تو انسان کے بچے کی طرح کھلایا گیا۔ گلاب کے پھول کی بھی وہ سیوا نہیں ہوتی جو انسان کے بچے کی سیوا ہوتی ہے، پھر اس کے بعد اس کو پڑھنے بٹھایا گیا، تو انسانوں کی طرح اس کے لئے کتابیں لکھی گئیں، اس کے لیے لائبریریاں تیار ہوئیں، اس کے لیے ادارے بنے، اس کے لیے تمام دنیا کے دانشوروں، فلاسفروں اور اسکالروں نے اپنا دماغ نچوڑ کر رکھ دیا ہے، یہ سب انسان کی طرح ہوا۔ اب اسکول جانے کے قابل ہوا تو انسان کے بچے کی طرح اسکول گیا، وہاں استادوں نے انسان کی طرح، انسان پر شفقت کی، اپنی اولاد کی طرح سینہ سے لگایا، اور اچھی سے اچھی باتیں اس کے کان میں ڈالیں، بہتر سے بہتر کتابیں اس کو پڑھائیں، یہ ایجوکیشن منسٹر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر سال کورس کو ترقی دی جاتی ہے Improve کیا جاتا ہے۔ نئے نئے تجربے تعلیم میں کیے جاتے ہیں، نئی نئی Theories آتی ہیں، امریکہ سے یورپ سے، جو نئے نئے تجربے ہیں وہ سب آزمائے جاتے ہیں، تاکہ تعلیم ترقی کرکے آسان ہو، یہ سب انسان کی خاطر ہے، اب اس نوجوان نے پڑھا اس کے بعد وہ کالج سے نکلا، گریجویشن کیا، پھر اور ایم۔ اے کیا، اگر وہ ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔ پی ایچ ڈی ہو جانا چاہتا ہے، پوسٹ گریجویٹ کا کورس وہ کر چکا ہے، باہر کی یونیورسٹیوں میں گیا یہ سب انسان کے پروسیس (Process) ہیں۔

آج ایک غلط نعرہ ہم کو پاگل بنا دینے کے لیے کافی ہے:

اس کے بعد میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے، لہر اٹھتی ہے پٹنہ سے، مونگیر سے، کشن گنج سے یا ادھر یوپی کے بارڈر سیوان سے، یا اس کے آگے سے، اور یہ سب پڑھے لکھے آدمی نہ صرف یہ کہ پاگل ہو جاتے ہیں بلکہ جانور بن جاتے ہیں، مجھے بتائیے یہ میرے لیے ایک پہیلی ہے جس کو بوجھنا چاہتا ہوں، وہ ایسا کونسا اسکریو Screw ڈھیلا ہو جاتا ہے کہ یہ انسان جو اپنے سینہ میں اتنا علم لیے بیٹھا ہے، سمندر کا سمندر پی گیا، کسی کی فلاسفی، کسی کی منطق، کسی کا علم اخلاق، فن سیاست، ادب و حکمت، شاعری و فنون لطیفہ، انسانی نفسیات، یہ سب پڑھنے کے بعد مجھے آپ بتائیے کہ وہ کونسا دھماکہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اچھا خاصا انسان جانور میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ اچھا خاصا خونخوار بھیڑیا ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے آپے ہی نہیں بلکہ جامے سے باہر ہو جاتا ہے، طالب علم طالب علم کو مارتا ہے، پروفیسر پروفیسروں کی نشاندہی کرتا ہے، کہتا ہے کہ دیکھو میرا ساتھی یہاں چھپا ہوا ہے جس نے دس برس تک لیبارٹری میں اس کے ساتھ کام کیا ہے، کاندھے سے کاندھا ملا کر لائبریری میں بیٹھا ہے آج وہ اس کی جاسوسی کرتا ہے، یہ کیا ہو جاتا ہے؟ یہ انسانیت پر کیسی بجلی گرتی ہے؟ نیویارک کے پاور ہاؤس پر بجلی گری میں اس وقت نیویارک کے قریب (فلاڈیلفیا میں) تھا، میری سمجھ میں آیا پاور ہاؤس بھی عقل نہیں رکھتا، بجلی بھی عقل نہیں رکھتی، ایک بے عقل بے عقل پر گر گیا، لیکن یہ عقلمند عقل پر کیسے گرتا ہے۔ (مسلسل تالیاں) بجلی تو بجلی ہے، کسی کو بے عقل و بے شعور پر غصہ نہیں آتا، کوئی اس کو ملامت کرتا ہے، یہ بات کتا بھی سمجھتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کتے کو آپ ڈھیلا مار دیجئے تو کتا ڈھیلے پر، پتھر پر نہیں دوڑتا، وہ آپ پر دوڑے گا، گویا کتے کو بھی یہ سمجھ ہے کہ پتھر کا قصور نہیں انسان کا قصور ہے، آپ مار کے دیکھ لیجیے، کتے کی دم آپ کے پاؤں کے نیچے